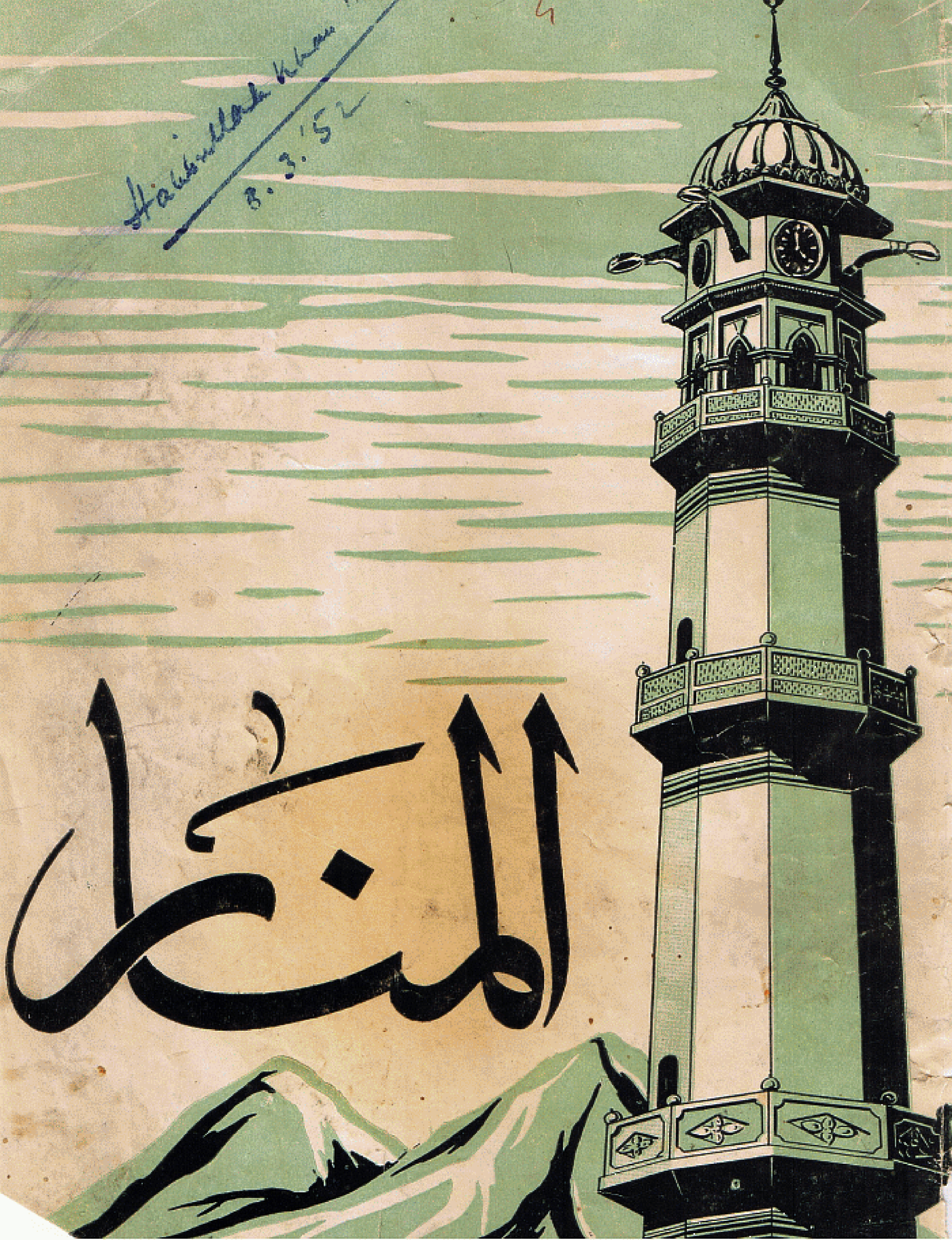

Habibullah Khan
8.3.'52
المنار

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

روشنی اور بلندی کا نشان

المنار

تعلیم الاسلام کالج لاہور

جلد نمبر ۲

شمارہ نمبر ۴

مدیر اعلیٰ

شیخ محبوب عالم خالد

بی اے (آنرز) ایم اے

مدیران

محمد اسلم باجوہ

نور الدّین امجد

فروری سنہ ۱۹۵۲ء

فہرس

خدا تعالیٰ اپنے بندوں کی دُعائیں سُنتا ہے

(۱) وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ ۖ أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ ۖ فَلْيَسْتَجِيبُوا لِي وَلْيُؤْمِنُوا بِي لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُونَ ۝
(البقرة ع ۲۳)

مطلب:۔ اور جب تجھ سے میرے بندے میرے متعلق پوچھیں، تو ان سے کہدے۔ کہ میں تو قریب (ہی) ہوں۔ میں دُعا کرنے والے کی دعا کو۔ جب وہ مجھے پکارتا ہے۔ قبول کرتا ہوں۔ پس انہیں چاہیئے کہ میری ہدایات کی تعمیل کریں اور میری قدرتوں پر یقین رکھیں تا کہ وہ صحیح راہ پر گامزن ہوسکیں۔

(۲) أَمَّنْ يُجِيبُ الْمُضْطَرَّ إِذَا دَعَاهُ وَيَكْشِفُ السُّوءَ ۝ (النمل ع ۵)

مطلب:۔ ہاں وہ کون ہے جو مضطر یعنی لاچار انسان کی پکار سُنتا ہے۔ جب وہ اس سے دعا کرتا ہے۔ اور اس کی تکلیف کو دُور کرتا ہے (وہ خدا ہی تو ہے)

دُعا قضاء و قدر کو بھی روک دیتی ہے

حضرت رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا:۔

(۱) "قضاء و قدر کو روکنے میں دُعا کے سوا کوئی چیز کارگر نہیں ہوتی"۔

(۲) "خُدا تعالیٰ کو یہ امر مرغوب ہے کہ اس سے مانگا جائے"۔

(۳) "جو شخص خدا تعالیٰ سے مانگتا نہیں۔ خدا تعالیٰ اس سے ناراض ہو جاتا ہے"۔ (ترمذی)

اِنسان کی حفاظت کا اصل ذریعہ دُعا ہے

"جو شخص دعا کو نہیں چھوڑتا۔ اس کے دین اور دُنیا پر آفت نہ آئے گی۔ وہ ایک ایسے قلعے میں محفوظ ہے جس کے اردگرد مسلّح سپاہی ہر وقت حفاظت کرتے ہیں۔ لیکن جو دعاؤں سے لاپرواہ ہے۔ وہ اس شخص کی طرح ہے۔ جو خود بے ہتھیار ہے۔ اور اس پر کمزور بھی ہے اور پھر ایسے جنگل میں ہے جو درندوں اور موذی جانوروں سے بھرا ہوا ہے وہ سمجھ سکتا ہے کہ اس کی خیر ہرگز نہیں ہے۔ ایک لمحہ میں وہ موذی جانوروں کا شکار ہو جائے گا۔ اور اس کی ہڈی بوٹی نظر نہ آئے گی۔ اس لئے یاد رکھو کہ انسان کی بڑی سعادت اور اس کی حفاظت کا اصل ذریعہ یہی دعا ہے۔ یہی دعا اس کے لئے پناہ ہے۔ اگر وہ ہر وقت اس میں لگا رہے"۔

(ملفوظات حضرت مرزا غلام احمد قادیانی علیہ السلام (الحکم ۲۴ ستمبر ۱۹۰۴ء)

دُکھ اور مصیبت میں خدا کے حضور جھکو

"انسان کو چاہیئے۔ کہ کسی مشکل۔ دکھ یا مصیبت کے وقت وضو کر کے خدا تعالیٰ کے حضور میں کھڑا ہو جائے۔ اور دعا کرے وہ درحقیقت انسان کی آواز کو سنتا ہے۔ اور وہ حلیم ہے علیم ہے اور حکیم ہے۔ کوئی اس کے سوا یار اور مددگار نہیں۔ آج کل کے ناقص اور نادان لوگ بیماری کے وقت طبیب کی طرف دوڑتے۔ اور مقدمہ کے وقت وکیل کی طرف جاتے ہیں۔ مگر اپنی کوشش اور بھروسہ کا کوئی خانہ خدا کے واسطے وہ نہیں رکھتے۔ گویا خدا تعالیٰ کو ان امور میں کوئی دخل ہی نہیں۔ مومن وہ ہے جو سب سے اوّل خدا کا خیال اپنے دل میں لائے۔ اور اس پر یقین اور توکل کو کامل رکھے۔ اور اس کے ماتحت اسباب کی تدبیر کرے۔ مگر لوگوں کا یہ حال ہے۔ کہ زبان سے کہتے ہیں۔ کہ ہم ایمان لائے۔ پر دل میں کچھ نہیں رکھتے"۔

(ملفوظات حضرت مرزا غلام احمد قادیانی علیہ السلام ۱۹۰۶ء)

حاجتیں پوری کرے گا کیا تری عاجز بشر
کر بیاں سب حاجتیں حاجت روا کے سامنے (درثمین)

غیر ممکن کو یہ ممکن میں بدل دیتی ہے
اے مرے فلسفیو! زورِ دعا دیکھو تو
(کلام محمود)

جناب حامد محمود

جذبۂ عشق

ذیل کے مضمون میں واقعات تاریخ سے اور جذبات فطرت کی گہرائیوں سے لئے گئے ہیں۔ (حامد محمود)

دن کا وقت تھا۔ مجلس میں چاروں طرف خاموشی تھی۔ ایک بزرگ ہستی جس کا چہرہ ایک بقعۂ نور تھا اور جس کے پاکیزہ جسم سے نہایت تیز مقناطیسی شعاعیں نکل نکل کر اس کے ہم مجلسوں کے دلوں کو مسحور کر رہی تھیں۔ مجلس کے درمیان بیٹھا تھا۔ وہ مقناطیسی شعاعیں جو اس کے جسم سے نکل رہی تھیں دو قسم کی تھیں۔ ایک محبت پیدا کرنے والی تھیں اور دوسری رعب۔ جن لوگوں کے دلوں کی کھڑکیاں کھلی تھیں —— وہ شعاعیں ان کے اندر داخل ہو کر عجیب کیفیت پیدا کر رہی تھیں۔ ایک طرف جذبۂ محبت تھا۔ جو بچہ کی ماں سے محبت کی نسبت بھی زیادہ ناز اور والہیت پیدا کر رہا تھا۔ دوسری طرف جذبۂ رعب تھا۔ کہ سلاطین و ملوک سے بھی زیادہ ادب و نیاز کا احساس پیدا کر رہا تھا۔ محبت کہتی تھی اس چہرے کو دیکھے جا۔ ادب کہتا تھا۔ آنکھیں نیچی رکھ۔ ناز کا اصرار تھا کہ باتیں کر اور کرتا ہی جا۔ نیاز کہتا تھا خاموش رہ اور کان رکھ۔

یہ منور وجود اور مقدس ہستی سادگی اور بے نفسی میں اپنی مثال آپ تھی۔ بادشاہانہ رعب تھا۔ مگر فقیرانہ لباس۔ سلاطین سے بڑھ کر دبدبہ تھا۔ مگر مسند شاہی کی جگہ ایک معمولی سا کپڑا نیچے بچھا ہوا تھا۔ اس میں اور اس کے ساتھیوں میں کچھ فرق نہ تھا۔ بلکہ ان میں سے کئی ایک کے لباس اس کے لباس سے بہتر تھے۔

خدا تعالیٰ نے جس طرح باطنی کمالات اس بزرگ کو دئے تھے۔ ظاہری خوبیاں بھی موجود تھیں۔ جسم کی بناوٹ میں کوئی ایسا نقص نہ تھا۔ کہ دیکھنے والے کو گھن آئے۔ بلکہ مردانہ حسن و خوبصورتی سے ایسے وافر حصہ ملا تھا جس کی وجہ سے انسان چہرے کو دیکھتے ہی ادب و محبت محسوس کرنے لگتا تھا۔ سچ ہے کہ خیالات انسان کے چہرے پر بھی اثر ڈالنے لگتے ہیں۔ اس بزرگ کا چہرہ ان تمام اندرونی نوروں کا شاہد تھا جو اسکے دل میں ایک وسیع سمندر کی طرح موجزن تھے اسکا قد میانہ اور رنگ خوبصورت اور سفید تھا۔ اسکے بال نہ تو گھونگر والے تھے نہ بالکل سیدھے رنگ کے لحاظ سے وہ کسی قدر سنہری تھے اسکا جسم بہت ملائم تھا اور اس میں سے خوشبو آتی تھی۔ اس کا سینہ چوڑا تھا۔ اور کندھوں کے درمیان بہت فاصلہ تھا جو وسعت حوصلہ اور سادگیٔ طبیعت پر دلالت کرتا تھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں موٹے موٹے تھے اور ہتھیلیاں بہت چوڑی تھیں جو ایک طرف شجاعت اور دوسری طرف سخاوت پر دلالت کرتی تھیں۔ وہ آہستہ آہستہ بات کرتا تھا اور مخاطب کے احساسات کا بہت ہی لحاظ رکھتا تھا۔ اس کے ماتھے پر شکن نہ تھے جس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ کبھی جوش میں آجانے کا عادی نہیں ہوا۔ وہ ہمیشہ مسکراتا تھا مگر لاابالی مترالے انسان کی مسکراہٹ نہیں۔ جو اسے اچھا مجلسی تو ثابت کرتی ہے۔ مگر قابل اعتبار دوست نہیں۔ بلکہ اس کے ہونٹوں پر ایک سنجیدہ اور افسردہ مسکراہٹ کھیلتی تھی۔ جو اسے اور بھی پیارا بنا دیتی تھی۔ کیونکہ اس کی خفیف شکنوں پر صاف طور پر لکھا ہوا نظر آتا۔ کہ اس مسکراہٹ کی غرض دوسروں کی دلداری اور دلجوئی ہے ورنہ غمخواری اور ذمہ داری نے اس کے دل کو درد و الم کا مخزن بنا رکھا تھا۔ ابھی ابھی کا واقعہ ہے کہ بیماری کی وجہ سے وہ خانۂ خدا میں نہ جا سکا۔ اس کے اصحاب جو اس کی خفیف سی تکلیف کو بھی برداشت نہ کر سکتے تھے اور اس کی تھوڑی سی جدائی کی بھی طاقت نہ رکھتے تھے گھبرا گئے۔ ایک اور شخص عبادت کے لئے کھڑا ہوا۔ اس کا کھڑا ہونا تھا۔ کہ عبادت گھر آہ و بکا کے شور سے گونج اٹھا۔ مرغ بسمل اس طرح نہیں تڑپتا جس طرح میدان جنگ کے شیر اور صف شکن بہادر کرب و اضطراب سے بے تاب ہو رہے تھے۔ آنسو تھے۔ کہ ان کی تار نہ ٹوٹتی تھی۔ سینے تھے کہ ابلنے والی ہنڈیا کی طرح کھد رہے تھے۔ وہ سہارا لے کر اٹھا اور دوسروں کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر کھڑکی تک آیا حالانکہ اس میں کھڑا ہونے کی بھی طاقت نہ تھی۔ اس نے کھڑکی کا پردہ ایک طرف کیا اور عبادت گھر کی طرف سر جھکا کر مسکرا... اس کی مسکراہٹ نے لوگوں کو وارفتہ کر دیا۔ وہ بے اختیار ہو کر نعرہ ہائے مسرت مارنے لگے۔ اس نے پھر اپنا سر اندر کر لیا۔ لوگ خوش تھے مگر

انہیں کیا معلوم تھا۔ کہ اس ذراسی مسکراہٹ کے پیدا کرنے کے لئے اسے کس قدر جذبات دردوالم کو محسوس کرنا پڑا۔ اے مقدّس وجود! میری جان تجھ پر فدا۔ میرا دل تجھ پر نثار ہو۔ تو نے موت کی آخری کشمکشوں میں بھی دوسروں کی ادنیٰ خوشی کو مقدم رکھا۔

ہاں تو آج بھی لوگوں کے چہرے افسردہ نظر آتے تھے مگر اس کے چہرے کی بشاشت قائم تھی۔ وہ انہیں اپنے آنے والی جدائی کے لئے تیار کر رہا تھا اور جس طرح آہن گر تلوار کو مکمّل کر کے اسے آخری دفعہ صیقل کرتا ہے وہ بھی اپنے اصحاب کے دلوں کو آخری دفعہ جِلا دے رہا تھا۔ وہ اُن کے سامنے سب ضروری سبق دُہرا رہا تھا۔ وہ خدا تعالیٰ کے جلال اور اس کی عظمت کی یاد ان کے دلوں میں تازہ کر رہا تھا۔ اس کی محبت کا ولولہ ان کے دلوں میں پیدا کر رہا تھا۔ ثبات و استقلال کی تعلیم دے رہا تھا۔ عورتوں سے حسنِ سلوک۔ غریبوں کے حقوق کی نگہداشت و یتیموں کی امداد۔ غلاموں کی آزادی کی تحریک۔ شکستہ دلوں کی دلدہی قرضداروں کی اعانت۔ مسافروں کے ساتھ حسنِ سلوک۔ رعایا کی بہتری کی کوشش۔ غیر مذہب والوں کے جذبات کا احترام۔ اخلاقِ فاضلہ کا قیام۔ عدل و انصاف کا اثبات غرض دنیا کی ہر ایک نیکی کی تعلیم اور ہر ایک بدی سے بچنے کی ہدایت وہ دے رہا تھا۔ مگر اپنا اور اپنے بیوی بچوں کا ذکر وہ بالکل حذف کر جاتا گویا اس وقت دنیا ساری تفاصیل کیساتھ اسکے سامنے موجود تھی مگر وہ اور اس کا گھرانہ بالکل غائب تھے مگر نہیں۔ میں غلطی کرتا ہوں وہ کبھی کبھی اپنا ذکر بھی کرتا تھا۔ مگر اس لئے نہیں کہ اپنے مخاطبوں سے اپنی قربانیوں کی داد طلب کرے۔ اپنی فدائیت کا صلہ مانگے یا اپنے رشتہ داروں کی سفارش کرے۔ نہیں بلکہ اس کے بالکل مخالف۔ وہ کبھی کبھی بات کرتے رک جاتا تھا۔ اور اس کے چہرہ پر انتہائی کرب و اضطراب کے آثار پائے جاتے تھے۔ اس کے دل سے ایک آہ نکلتی تھی ایسی آہ! جس کی گہرائیوں کا اندازہ لگانا انسانی طاقت سے بالا ہے وہ کچھ دیر خاموش رہ کر بولتا اور اس کی آواز جذباتِ غم کا ایک ایسا ہیجان ظاہر کرتی جس کے مقابلہ میں سمندر کے تلاطم بھی کچھ حقیقت نہیں رکھتے۔ وہ مضطربانہ طور پر کہتا۔ کہ خدا یہود و نصاریٰ پر لعنت کرے انہوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو مساجد بنا لیا۔ ان فقروں کے بولتے وقت اس کی عجیب کیفیت ہوتی تھی۔ وہ حسرت و غم کا مجسمہ بن جاتا اور درد والم کی تصویر۔ بالکل یوں معلوم ہوتا تھا۔ کہ اس کی آواز ایک ایک لہر کے ساتھ بے تعداد تمنائیں اور التجائیں لپٹی ہوئی ہیں

اور وہ اپنی تمام عمر کی خدمات اور قربانیوں کا آخری بدلہ مانگتا ہے۔ کیا بدلہ؟ یہ کہ اس کی قبر کو شرک کی جگہ نہ بنایا جائے۔ اس کی آواز غم والم میں اس طرح ڈوبی ہوئی نکلتی تھی کہ گویا اس کی اور اس کے خاندان کی تمام بہبود صرف اس سوال کے جواب میں پوشیدہ ہے۔ وہ اپنے لئے صرف یہ مانگتا تھا۔ کہ اسے پیدا کرنے والے کی عزت چھین کر اسے نہ دے دی جائے۔ میری جان اس پر فدا اور میرا دل اس پر قربان ہو۔ وہ کیسا وفا شعار تھا۔

میں پھر اپنے مطلب سے دُور چلا گیا۔ میں کہہ رہا تھا۔ کہ ایک دن وہ اپنی آنے والی جدائی کے برداشت کرنے کے لئے اپنے احباب کو تیار کر رہا تھا اور اپنی پاکیزہ تعلیم کے خوش نما آثار پر پھر ایک دفعہ تکرار کے خطوط کھینچ کر انہیں جِلا دے رہا تھا۔ آخر اس نے کہا کہ اس کا کام ختم ہو گیا ہے۔ اور وہ اپنا مقصد پورا کر چکا ہے۔ اس وقت اس کے احباب کی عجب کیفیت تھی۔ اگر کبھی بھی انسان کا گوشت، اور پوست جذبات و احساسات کی شکل میں بدل گیا ہے تو اس وقت اس کے احباب کا یہی حال تھا۔ وہ مجسم احساس بن رہے تھے۔ ان کا گوشت بھی احساس بن رہا تھا اور پوست بھی اور ہڈیاں بھی۔ اور ان کے اندر کا گودا بھی۔ وہ مغز بن گئے تھے۔ بغیر چھلکے کے۔ اور خوشبو بن گئے تھے۔ بغیر پتیوں کے۔ وہ نفوسِ قدسیہ تھے۔ جو مادہ کی حدبندی کو توڑ چکے تھے اور بلند پرواز طائر تھے۔ جو زمین کی کثافتوں سے بالا ہو چکے تھے۔ اس نے اُن کی طرف دیکھا۔ اور کہا کہ میں بھی ایک انسان ہوں جس طرح تم انسان ہو۔ مجھے ہمیشہ تم سے معاملات پیش آتے رہتے تھے بالکل ممکن ہے کہ کبھی میرے ہاتھ سے کسی کو کوئی اذیت پہنچ گئی ہو، میں نہیں چاہتا۔ کہ قیامت کے دن خدائے قادر کے سامنے مجھے جوابدہ ہونا پڑے جس کو میرے ہاتھ سے اذیت پہنچی ہو۔ وہ آج مجھ سے بدلہ لے لے۔

یہ فقرے گویا اس کے اصحاب کی کمر توڑنے کے لئے آخری تنکا تھے۔ ان کے دل پگھل گئے اور ان کی آنکھیں ساون کی جھڑی کی طرح برس پڑیں۔ ان کا پیارا جس نے اپنی عمر دنیا کو اذیت سے بچانے کے لئے اور غلامی سے چھڑانے کے لئے خرچ کر دی۔ وہ۔ اور اس کے ہاتھ سے کسی کو اذیت پہنچی ہو۔ وہ اور اس سے کوئی شخص بدلہ لینے کا خیال کرے۔ اگر چاند تک بچّہ کا ہاتھ پہنچ سکتا ہے۔ یا اگر انسانی

آنکھ عالم کی انتہا تک پہنچ سکتی ہے تو بے شک اس سرتا پا نور وجود کا بھی عیب کسی کو نظر آسکتا ہے۔ مگر جب حقیقت یہ ہے کہ چاند میں داغ ہیں مگر اس وجود کی مطہر زندگی داغوں سے پاک ہے۔ تو پھر اس سے بدلہ لینے کے معنے ہی کیا ہوئے۔

سُورج چمک رہا تھا مگر اس کی شعاعیں دُھندلی نظر آنے لگ گئیں۔ ہوائیں چل رہی تھیں مگر ان پر ایک سکوت کا سا عالم طاری ہو گیا تھا۔ درخت ہل رہے تھے۔ مگر ایسا معلوم دینے لگا۔ گویا وہ ٹھہر گئے ہیں۔ پرندے گا رہے تھے مگر ایسا محسوس ہوتا تھا۔ گویا ان کے گانے میں سے خاموشی کی لہریں پیدا ہو رہی ہیں۔ سب لوگ محوِ حیرت ہی تھے کہ ایک شخص بولا حضورؐ! ایک جنگ کے موقع پر آپ صف بندی کرا رہے تھے۔ تو ایک صف سے گزر کر آپ کو آگے جانے کی ضرورت پیش آئی۔ آپ جس وقت صف کو چیر کر آگے گئے۔ تو آپ کی کہنی میری پیٹھ کو لگی۔

ہر وہ شخص جو محبت اور عشق کا مزا جانتا ہے سمجھ سکتا ہے کہ اس وقت مجلس کا کیسا حال ہو گیا ہوگا۔ تمام حاضرین پر ایک سناٹا چھا گیا۔ کئی منچلوں کی تلواریں میانوں سے نکل نکل پڑتی تھیں۔ آنکھیں شرربار تھیں مگر دم مارنے کا یارا نہ تھا۔ ہونٹ پھڑپھڑاتے تھے۔ مگر بولنے کی طاقت نہ تھی۔ دماغ پر جوش و غضب کا تسلط ہو رہا تھا۔ مگر اظہار کی جرأت نہ تھی۔ سورج اسی طرح چمک رہا تھا۔ مگر محبت کی آنکھ سے دیکھنے والوں کو یُوں نظر آیا۔ کہ جیسے اس کی شعاعیں تیز ہو گئی ہیں۔ اور اس کی دُھوپ سُرخ ہو رہی اور دُنیا کو جلانے کے لئے تیار ہے۔ ہوائیں اسی طرح چل رہی تھیں۔ مگر یوں معلوم دینے لگا۔ گویا ان کی رفتار میں تیزی پیدا ہو گئی ہے اور وہ دُنیا کو تباہ کرنے پر تُلی ہوئی ہیں۔ درخت اسی طرح ہل رہے تھے۔ مگر نظر یُوں آتا تھا۔ گویا وہ ابھی زمین سے اُکھڑ کر جا پڑیں گے۔ پرندے ویسی ہی میٹھی آواز سے گا رہے تھے۔ مگر محبت کے کان ایک کان پھاڑ دینے والا شور سُن رہے تھے۔ جو دوزخ کی چیخ کے مشابہ تھا۔ غرض سب مجلس میں کیا متکلم اور کیا سامع۔ سب کے دلوں میں ایک ہیجان برپا تھا۔ اور ہر ایک کی قلبی کیفیت کے مطابق عالم میں بھی ایک تغیر نظر آ رہا تھا۔ مگر ایک شخص ان سب ہیجانوں سے بالا تھا اور وہ وہی بزرگ انسان تھا جس نے ہر اُس شخص کو بدلہ دینے کی دعوت دی تھی۔ جسے اس کے ہاتھوں سے کوئی نقصان پہنچا ہو۔ اُس نے نہایت متانت اور خوشی سے جواب دیا۔ کہ لو میں بیٹھا ہوں۔ میری پیٹھ پر کہنی مار لو۔ حضارِ مجلس کے دماغ جوشِ غضب سے اُبل رہے تھے۔ مگر وہ کچھ نہ کہہ سکتے تھے۔ یقیناً خدا کے فرشتے اس وقت اُس خدا کی حمد گا رہے تھے جس نے اس رسُولؐ کو پیدا کیا تھا۔

وہ شخص جس نے بدلہ کا مطالبہ کیا تھا۔ اٹھا اور اُس نے کہا کہ جناب جس وقت مجھے آپ کی کہنی لگی تھی۔ اس وقت میرا جسم ننگا تھا۔ پس بدلہ پُورا نہیں ہو سکتا۔ جب تک آپ کے جسم پر سے بھی کُرتہ نہ اتارا جائے۔ اُس بزرگ نے فوراً اپنی پیٹھ پر سے کُرتہ اونچا کر دیا کہ لو اب کہنی مار لو۔ اس وقت لوگوں کے دلوں کی حرکت بند ہو گئی اور دنیا ایک عالمِ خموشاں نظر آنے لگی۔ ہر ایک شخص حیران تھا کہ وہ شخص جو بدلہ کے لئے آمادہ تھا۔ کیا دیوانہ ہے۔ اگر اس بزرگ کا ڈر نہ ہوتا۔ تو اُس وقت اُس شخص کی ایک بوٹی بھی نظر نہ آتی مگر اس کے ثبات میں بھی کچھ فرق نہ آیا۔ اُس نے لوگوں کے غصّہ کی بھی پروا نہ کی۔ وہ اُٹھ کے اس بزرگ کے پاس آیا۔ اور پیٹھ کی طرف جُھکا۔ اس کے چہرہ کے اعصاب اُس وقت پھڑک رہے تھے۔ اُس کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔ اس کے نتھنے پھُول رہے تھے۔ وہ نیچے جُھکا۔ اور اُس بزرگ کی ننگی پیٹھ کو ادب سے اپنے ہونٹوں سے چُھوا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے اور خدا کی حمد بجا لاتا ہوا وہ کھڑا ہو گیا۔ وہ آنسو جذبۂ عشق کے آنسو تھے۔ اس نے کہا حضورؐ کُجا بدلہ اور کُجا یہ خادم! جس وقت حضورؐ سے یہ معلوم ہوا۔ کہ شائد وہ وقت قریب آ پہنچا ہے۔ جس کے خیال سے بھی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں تو میں نے چاہا۔ کہ میرے ہونٹ ایک دفعہ اس بابرکت جسم کو مَس کر لیں جسے خدا تعالیٰ نے برکتوں کا مجموعہ بنایا ہے۔ پس میں نے اس کہنی کو اپنے مقصد کے پُورا کرنے کا ذریعہ بنایا۔ جس کا لگنا اس وقت بھی میرے لئے موجبِ فخر تھا اور آج بھی!

جماعت پر سے حیرت دُور ہو گئی۔ تعجب کی سختی جاتی رہی، اور دل پھر نرمی سے حرکت کرنے لگے۔ کئی دماغ جو پہلے غصّہ کے خیالات سے لبریز تھے۔ اب وہ رشک کے جذبہ سے معمُور ہو گئے۔ سُورج اب بھی چمک رہا تھا۔ مگر اب اس کی روشنی بہت خوبصورت اور بجلی سے بھری ہوئی معلُوم ہوتی تھی۔ درخت اب بھی ہل رہے تھے مگر اب ان کی حرکات خوشی کے ناچ کے مشابہ لگتی تھیں۔ ہوائیں اب بھی چل

رہی تھیں۔ مگر اب ان میں دیارِ محبوب کی خوشبو ملی ہوئی معلوم دیتی تھی پرندے اب بھی گا رہے تھے۔ مگر یوں معلوم ہوتا تھا۔ کہ گویا وہ حمد و ثناء کے گیت گا رہے ہیں۔ مجلس میں افسردگی کے باوجود خوشی کی ایک لہر دوڑ رہی تھی۔ اور اس کا سبب جذبۂ عشق کا وہ مظاہرہ تھا جو اوپر بیان ہوا۔ اس بزرگ کے ہونٹوں پہ اسی طرح مسکراہٹ تھی — اور مسکراہٹ کے پیچھے ایک بارِ الم و غم تھا۔ یہ بزرگ میرا محمدؐ تھا اور اہلِ مجلس اُس کے صحابہؓ تھے۔ اللّٰھم صلِّ علیٰ محمدٍ وّ علیٰ اٰلِ محمدٍ وبارک وسلّم۔ انّک حمیدٌ مجیدٌ۔ "الفضل"

(پروفیسر) صوفی عبدالعزیز ایم اے

عجب لعلیست در کانِ محمدؐ

(تخمیس)

مری رگ رگ پہ احسانِ محمدؐ — مرا ہر مُو ثنا خوانِ محمدؐ
میں کیونکر ہوں نہ قربانِ محمدؐ — عجب نوریست در جانِ محمدؐ

عجب لعلیست در کانِ محمدؐ

محمدؐ کی ہے سب سے شان یکتا — زمیں بھی آسماں بھی اُس پہ شیدا
ہے خود اللہ کو وہ سب سے پیارا — عجب دارم دلِ آں ناکساں را

کہ رُو تابند از خوانِ محمدؐ

جہاں میں ہیں کروڑوں ابنِ آدم — ملائک آسماں پہ بھی نہیں کم
اجنّہ کی بھی ہستی ہے مسلّم — ندانم ہیچ نفسے در دو عالم

کہ دارد شوکت و شانِ محمدؐ

مرے لب پر ہے بس ذکرِ محمدؐ — زباں کرتی ثنا رہتی ہے بیحد
فدا حضرت پہ ہوں میرے اب و جد — سرے دارم فدائے خاکِ احمدؐ

دلم ہر وقت قربانِ محمدؐ

محمدؐ پر مرا ایماں ہے محکم — محمدؐ کے ہے آگے سر مرا خم
تصدّق اس پہ جاں میری ہے ہر دم — دگر اُستاد را نامے ندانم

کہ خواندم در دبستانِ محمدؐ

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی

اردو کی ابتداء کا مسئلہ

(فاضل مقالہ نگار نے یہ مقالہ بزم اردو تعلیم الاسلام کالج کے ایک اجلاس میں پڑھا —— مدیر)

اردو کی ابتداء کے بارہ میں بڑا اختلاف رہا ہے۔ ایک عرصہ تک لوگوں کا خیال تھا۔ کہ اردو کو فارسی کی ایک شاخ یا ذیلی زبان سمجھنا چاہیئے۔ کیونکہ اس کا رسم الخط وہی ہے جو فارسی کا ہے۔ سوائے اس کے کہ ہندی کی مخصوص آوازوں کو ظاہر کرنے کے لئے جو فارسی میں نہیں ہیں۔ فارسی حروفِ تہجی میں سے بعض پر توضیحی نشانات لگائے گئے ہیں۔ مثلاً ٹ۔ ڈ۔ ڑ وغیرہ۔ رسم الخط کے علاوہ اردو میں فارسی الفاظ اور تراکیب بے دریغ استعمال ہوتی ہیں۔ نظم و نثر میں ایسی عبارت لکھنا ممکن ہے جس میں صرف حرف اور فعل اردو ہو، اور باقی سب فارسی۔ مثلاً مرزا غالب کا یہ شعر جو ان کے اردو دیوان میں موجود ہے ؎

شمارِ سبحہ مرغوبِ بتِ مشکل پسند آیا
تماشائے بیک کف بردنِ صد دل پسند آیا

اگر بجائے آیا کے آمد کر دیا جائے تو شعر فارسی کا ہو جاتا ہے

پھر جب اردو شاعری اور ادب کی تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں تو اردو میں وہی اصناف رائج نظر آتی ہیں جو فارسی میں ہیں۔ مثلاً غزل، قصیدہ، مثنوی۔ رباعی، قطعہ، مثلث، مسدس، مخمس، مستزاد، اور وہی صنائع و بدائع کلام میں لائے جاتے ہیں جو فارسی میں ہیں۔ تنقید میں متقدمین نے وہی اصطلاحات استعمال کی ہیں جو فارسی شاعری کی تنقید میں استعمال ہوئی ہیں۔ نظم سے قطع نظر نثر کی تاریخ میں بھی یہی صورت نظر آتی ہے۔ یہ بات عام طور پر معلوم ہے کہ ابتدائی دور میں نثر تصانیف کا موضوع یا مذہب تھا یا داستان گوئی اور ان دونوں میں فارسی سے بکثرت ترجمے کئے گئے۔ اور جو طبعزاد کتابیں لکھی گئیں۔ وہ بھی انہی کی تقلید اور انداز پر لکھی گئیں۔ لیکن ان تمام رشتوں کے باوجود اردو فارسی نژاد نہیں ہے۔ یہ خالص ہندوستانی زبان ہے۔ اسی ملک میں پیدا ہوئی اور پروان چڑھی۔ اس کا خمیر ملکی زبانوں سے تیار ہوا۔ فارسی نے اس کی نشو و نما میں نمایاں حصہ ضرور لیا ہے لیکن اس کی ساخت پر فارسی کی بجائے ہندوستانی اثرات زیادہ ہیں۔ فارسی الفاظ اسماء کی صورت میں زیادہ ہیں اور یہ اُن چیزوں کے نام ہیں جو مسلمان اپنے ساتھ لائے۔ بہت کم فارسی کے مصادر اردو میں آئے ہیں اور اس سے کم محاوروں کے ترجمے ہیں۔ زبان کی ساخت کا معیار افعال اور اُن کی گردان سے قائم ہوتا ہے اور اس باب میں اردو فارسی سے مختلف ہے فارسی میں فعل مؤنث اور فعل مذکر کی تمیز نہیں۔ اردو میں فاعل کی نسبت سے فعل میں صیغہ جنس کا اضافہ کیا جاتا ہے یہی حال صفات کا ہے۔ کہ فارسی میں صفت میں موصوف کی نسبت کا صیغہ نہیں ہے لیکن ہندوستانی زبانوں میں ہے۔ یہی حال نحوی قاعدوں کا ہے۔ فارسی میں ترکیبِ اضافی کی صورت یہ ہے۔ کتابِ تازہ، اردو میں تازہ کتاب اور اس میں اضافت کی بھی ضرورت نہیں۔ اسی طرح اردو میں سابقوں اور لاحقوں کی فہرست پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستانی سابقوں کی تعداد فارسی سے بہت زیادہ ہے۔ مختصر یہ کہ اس طرح اردو کا فارسی نژاد ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ بلکہ یہ زبان اپنی اصل اور ساخت میں خالص ملکی نظر آتی ہے۔

اردو کی ابتداء کے سلسلے میں پہلے نظریے کی بنیاد محض اس زبان کے نام "اردوئے معلیٰ" پر قیاس کر کے رکھی گئی ہے۔ اس نظریہ کا خلاصہ یہ ہے۔ کہ جب گیارھویں صدی ہجری کے نصف اول میں شاہجہان نے دلی میں شاہجہان آباد کے نام سے ایک نئی بستی کا اضافہ کیا۔ تو ایک "لشکری بازار" بھی تعمیر ہوا جس کا نام اردو بازار تھا۔ اس بازار میں مختلف ملکوں اور علاقوں کے لشکری جمع ہوتے تھے۔ اُن کی زبانیں مختلف تھیں۔ آپس کے اختلاط سے ایک نئی زبان پیدا ہو گئی جس کا نام "زبانِ اردوئے معلیٰ" قرار پایا۔ یہی زبان ترقی کر کے موجودہ اردو بنی۔ رفتہ رفتہ زبان کا لفظ محذوف ہو گیا اور زبان کو اردوئے معلیٰ

پھر صرف اردو کہنے لگے۔ انشا نے اس میں ایک اور لطیفے کا اضافہ کیا ہے۔ لکھتے ہیں۔ کہ شاہجہان آباد میں مختلف ملکوں کے ارباب علوم شریفہ و اصحاب فنون لطیفہ بہت جمع تھے۔ وہاں کے خوش بیانوں نے مختلف زبانوں سے دلچسپ الفاظ علٰحدہ کرکے اور بعض الفاظ اور عبارات میں تصرف کرکے ان زبانوں کے علاوہ ایک نئی زبان بنالی اور اس کا نام اردو رکھا۔ گویا انشا کے بقول ایک مجلس مشاورت نے ایک نئی زبان ایجاد اور اختیار کر لی۔ اور اس طرح پلک جھپکنے میں ایک نئی زبان وجود میں آگئی۔ دنیا کے کسی علاقہ میں کوئی زبان کبھی اس طرح وجود میں نہیں آئی۔ غالباً اپنی طبیعت کی تیزی میں انشا نے لغت اور اصطلاح کے فرق کو نظر انداز کر دیا۔ لغت: ایسے الفاظ اور اُن کے معانی ہیں۔ جن پر جمہور کا اتفاق ہو۔ اور اصطلاح: ایسے الفاظ اور اُن کے معانی جن پر ایک جماعت یا گروہ کا اتفاق ہو۔ انشا کی مجلس مشاورت اصطلاحوں پر تو اتفاق کر سکتی تھی لیکن لغت کے معاملہ میں جمہور کا یہ حق انہیں کسی ملکی قانون یا لسانیاتی اصول سے نہیں مل سکتا تھا۔ پھر زبان کا "اردو" نام اس وقت نہیں رکھا گیا۔ سب سے پہلے زبان اردوئے معلّٰی کی ترکیب میر تقی میر نے اپنے تذکرے نکات الشعراء میں استعمال کی ہے۔ میر امّن اور شیر علی افسوس اسے "اردو کی زبان" کہتے ہیں۔ صرف لفظ اردو زبان کے معنوں میں سب سے پہلے مصحفی کے اس شعر میں ملتا ہے ؎

خدا رکھے زبان ہم نے سُنی ہے میر و مرزا کی
کہیں کس منہ سے ہم اے مصحفی اردو ہماری ہے

اس کے بعد گل کرائسٹ نے اردو کا لفظ زبان کے معنوں میں استعمال کیا ہے۔ لیکن وہ اسے کوئی الگ زبان نہیں سمجھتے۔ بلکہ محض ہندوستانی زبان کے ایک خاص محاورے کو اردو کا نام دیتے ہیں۔ اُن کے نزدیک ہندوستانی زبان کے تین محاورے ہیں۔ ایک جسے وہ COURT OR HIGH STYLE یعنی درباری یا معلّٰی کہتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ مسلمانوں کا محاورہ ہے جس میں عربی فارسی الفاظ کی کثرت ہوتی ہے۔ دوسرا محاورہ ہندوی یا ہندی ہے جس میں عربی فارسی کی جگہ سنسکرت کی آمیزش ہوتی ہے۔ ان دونوں محاوروں کی درمیانی شکل کو انہوں نے "کھڑی بولی" کے نام سے یاد کیا ہے۔ اور اسی کو مشہور فرانسیسی محقق گارساں دتاسی "کھڑی" کی بجائے "کھری بولی" سمجھتا ہے۔

بعض لوگ آزاد پر بھی یہ الزام لگاتے ہیں کہ انہوں نے اردو کی ابتدا شاہجہان کے عہد سے کی ہے۔ لیکن اس بہتان کی تردید، آبِ حیات کی اس عبارت سے ہوتی ہے۔

"اسے فقط شاہجہان کا اقبال کہیے۔ کہ یہ زبان خاص و عام میں اس کے اردوئے معلّٰی کی طرف منسوب ہوگئی ورنہ نظم و نثر کی جو شاخیں اوپر بیان ہوئیں ان سے خیال کو وسعت دے کر کہہ سکتے ہیں کہ اس زبان کی ابتدا اس وقت ہوئی ہوگی جب مسلمانوں کا قدم پہلے پہل اس ملک میں آیا —"

اردو کی ابتدا کے بارہ میں دوسرے نظریے کی بنیاد دلّی سے اردو کے نسبتاً زیادہ نمایاں تعلق پر رکھی گئی ہے۔ بعض مصنفین کے نزدیک مسلمانوں کی آمد سے پہلے دلّی کے ہندو اپنی اپنی بھاشا یا بھاکا بولتے تھے مسلمانوں کے آنے سے ان کی بھاشا میں فارسی۔ عربی۔ ترکی الفاظ کی آمیزش شروع ہوئی اور یہی مخلوط زبان ترقی کرتے کرتے اردو بن گئی۔ منجملہ اور لوگوں کے میر امّن۔ سر سیّد احمد خان۔ عبدالغفور نسّاخ وغیرہ اس خیال کے حامی ہیں۔ لیکن زبان کی ایک نمایاں شکل کس زمانے میں پیدا ہوئی۔ کہ اسے بھاشا سے ممتاز کیا جا سکے۔ اس کے بارہ میں اختلاف تھا۔ میر امّن کے نزدیک اکبر کے عہد میں یہ صورت پیدا ہوئی۔ سر سیّد کے بقول خلجیوں کے عہد میں جب امیر خسرو نے اس زبان میں شعر کہے۔ اس کی علیحدہ شکل پیدا ہوئی اور اورنگ زیب کے عہد میں اس میں شعر کہنا شروع ہوا۔

ان لوگوں نے ایک نئی زبان کے پیدا ہونے کی جو صورت بتائی ہے وہ قابلِ قبول ہے لیکن اعتراض یہ ہے کہ مسلمانوں اور ہندوؤں کی زبانوں کی آمیزش و آویزش دلّی سے پہلے ہندوستان کے اور علاقوں میں شروع ہوئی۔ مسلمان پہلے سندھ اور پنجاب میں آئے۔ اس لئے اس آمیزش کی ابتداء اُن ہی علاقوں سے شروع ہوئی ہوگی۔ اس کے بعد دلّی میں، اور بعد ازاں دکن میں۔ لیکن بعض سیاسی اور سماجی اسباب کی بنا پر جن میں دلّی میں فارسی کا اثر و اقتدار سب سے نمایاں ہے۔ اس کی نشو و نما دلّی سے پہلے اور بہت زیادہ دکن میں ہوئی اور جب شمالی ہندوستان میں اس کی حیثیت محض ایک عوامی بولی کی تھی

دکن میں شاہی سرپرستی میں اسی زبان میں نظم و نثر کی اعلیٰ درجے کی تصانیف لکھی جا رہی تھیں۔

لسانیاتی تحقیقات سے بھی اس اعتراض کی تائید ہوتی ہے لسانیاتی اعتبار سے اردو میں جو خصوصیات پائی جاتی ہیں وہ دلّی کی بھاشا سے مختلف ہیں اور پنجابی سے قریب تر ہیں۔ اردو اور پنجابی کے اس قریبی تعلق کو سب سے پہلے ہندوستانی لسانیات کے مشہور عالم سر جارج گریرسن نے اپنے جائزہ لسانیہ ہند میں تفصیل سے بیان کیا۔ اس نے اردو، پنجابی اور برج بھاشا کی قواعد کے خاکے تیار کئے اور یہ محسوس کیا کہ فعل کی گردان اور دوسری صرفی شکلوں میں اردو پنجابی سے بہت قریب ہے۔ ان کی دلیلوں میں سب سے قوی دلیل الفاظ کے آخر میں آنے والے حروف پر مبنی ہے۔ ان الفاظ کی دو شکلیں ہیں۔ ایک وہ جو الف پر ختم ہوتے ہیں اور ایک وہ جو "و" پر ختم ہوتے ہیں۔ گریرسن نے ان الفاظ کو "A" ENDING ـــــ اور "O" ENDING کہا ہے۔ برج بھاشا اور مغربی ہندی کی دوسری شاخیں "O" ENDING ہیں۔ پنجابی "A" ENDING ہے۔

پروفیسر محمود شیرانی نے اردو کی ابتدائی نشو و نما میں پنجابی کا حصہ اپنی مشہور تصنیف "پنجاب میں اردو" میں بیان کیا ہے۔ اور اپنے دعوے کی بنیاد گریرسن کی انہی تحقیقات پر رکھتی ہے۔ انہوں نے تاریخی حوالوں، قدیم تصانیف اور اشعار سے یہ بات ظاہر کی ہے کہ مسلمان جب دلّی گئے، تو پنجاب سے یہی زبان لے کر گئے، اور دلّی سے یہ زبان دکن پہنچی۔ یہی وجہ ہے کہ قدیم دکھنی اور قدیم پنجابی میں بہت سے مشترک عناصر پائے جاتے ہیں۔

بعض اور محققین نے تحقیقات کا ایک قدم اور آگے بڑھایا ہے۔ اور سندھ کو اردو کا جنم بھوم قرار دیا ہے۔ ان کے دعوے کی بنیاد لسانیاتی نہیں تاریخی ہے۔ اور اس حصے میں حبیب الرحمان شروانی اور سید سلیمان ندوی شامل ہیں۔ سید سلیمان ندوی کا استدلال ہے کہ ظہور اسلام سے قبل بھی عرب و ہند کے تعلقات نہایت مستحکم تھے۔ عرب تجار کی آمد و رفت کے باعث عربی کے کچھ الفاظ یہاں کی زبانوں میں اور یہاں کے الفاظ عربی میں شامل ہو گئے۔ پھر مسلمانوں نے سندھ فتح کیا۔ اور سندھ میں عربوں کی بستیاں قائم ہو گئیں۔ اس زمانہ میں سندھی پر عربی کا اثر زیادہ ہوا۔ آج تک سندھی کا رسم الخط عربی نسخ ہے اور سندھی زبان میں عربی الفاظ کی کثرت ہے۔ اس کے علاوہ قدیم عرب سیاحوں مثلاً ابن قرص، اصطخری اور ابشاری نے اپنے سفرناموں میں سندھ میں سندھی اور عربی بولے جانے کا ذکر کیا ہے۔ یہ تاریخی حوالے سب درست ہیں لیکن یہ استدلال لسانیاتی نقطہ نظر سے نہایت کمزور ہے۔ سندھی ایک آریائی زبان ہے۔ عربی سامی خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ دونوں میں اصول ساخت کا بنیادی فرق ہے۔ عربی میں اشتقاق کے قاعدے آریائی زبانوں کے اصولوں سے بالکل مختلف ہیں۔ یہ ممکن ہے۔ سندھی میں عربوں کے ساتھ لائی ہوئی چیزوں کے نام بطور اسماء شامل ہو گئے ہوں لیکن قواعد صرف و نحو میں سندھی آج بھی خالص ہند آریائی زبان ہے۔ اور گریرسن کی تقسیم کے مطابق ہندوستانی زبانوں کے اس حلقے سے تعلق رکھتی ہے جسے وہ بیرونی حصہ (OUTER CIRCLE) کہتا ہے۔ اور جس میں سندھی کے ساتھ راجستھانی اور گجراتی بھی شامل ہیں۔ اور جو اس کی لسانیاتی تقسیم میں "O" ENDING قبیلے سے تعلق رکھتی ہیں۔ رسم الخط کی شہادت بھی مشکوک ہے۔ سندھ کے مسلمانوں کا رسم الخط بیشک عربی نسخ ہے، لیکن یہ کب اختیار کیا گیا اور اس رسم الخط میں سندھی کی قدیم ترین تحریر کس زمانہ سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ مسائل ہنوز تشنۂ تحقیق ہیں۔ سندھ کے ہندو جو رسم الخط استعمال کرتے تھے وہ بھی رسم الخط کی ایک شکل اور دیوناگری سے قریب ہے۔ دوسرے نسخ رسم الخط صرف سندھی سے مخصوص نہیں۔ فارسی میں نستعلیق سے پہلے یہی رسم الخط تھا۔ دکھنی کی قدیم تحریریں جو دسویں اور گیارھویں صدی ہجری سے تعلق رکھتی ہیں، نسخ میں تحریر ہیں۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ کا کلیات بھی نسخ میں لکھا گیا اور شمال میں بھی اردو کی قدیم کتابیں نسخ میں لکھی ملتی ہیں۔ مثنوی میر حسن کا ایک نسخہ سنہ ۱۲۰۶ ہجری کا نسخ میں لکھا ہوا میں نے دیکھا ہے۔

لسانیاتی نقطہ نظر سے اردو کی ابتداء کا حال بیان کرنے کے لئے ہمیں اپنی بحث کا آغاز اصل آریائی زبان سے کرنا پڑے گا۔ یہ وہ زبان ہے، جو آریا ہجرت سے قبل اپنے اصلی وطن میں بولتے ہونگے اس کی کوئی تحریری شہادت یا دستاویز ہم تک نہیں پہنچی۔ لیکن آریائی نسل کے جو لوگ ایشیا اور یورپ میں آباد ہیں۔ اُن کی زبانوں سے قدیم ترین الفاظ میں اشتراک ڈھونڈ کر ماہرین لسانیات نے ایک قیاسی خاکہ تیار کیا ہے۔ اور اس میں ایک چھوٹی سی کہانی لکھی ہے۔ یہ زبان سنسکرت

اور زرتشتی ژند و پاژند کی زبان سے بہت ملتی جلتی ہے۔ ژند و پاژند اور ویدک سنسکرت اس اصل بنیادی آریائی زبان کے بعد آریائی زبان کے دوسرے دَور سے تعلق رکھتی ہیں۔ جب آریوں کی ایک شاخ ایران میں اور ایک ہندوستان میں آباد ہو چکی تھی لیکن اس وقت تک دونوں کے تصورات، رسُوم اور دیو مالا میں مُشترک عناصر بہت نمایاں ہیں۔ اس کے بعد آریائی زبانوں کا تیسرا دور شروع ہوتا ہے جس میں ملکی مقامی اثرات زرتشتی ژند و پاژند اور ہند آریائی سنسکرت پر اثر انداز ہونے لگتے ہیں۔ اور اس طرح زبانوں کے ایرانی اور ہندوستانی خاندان الگ الگ ہو جاتے ہیں۔ ہندوستان پہنچکر آریوں نے فتح مندی کے جوش میں اپنی زبان کو زبانِ الٰہی یعنی دیو بانی قرار دے کر عرصہ تک اس کی تقدیس کو بچانے کے لیے برہمنوں کو اس کا محافظ قرار دیا۔ اور بیچارے شودروں کے لیۓ اس زبان کے سننے کے جرم میں بڑی بڑی سزائیں مقرر کیں لیکن سنسکرت اس وقت تک تحریر میں نہیں آئی تھی۔ ویدوں کی ترتیب و تدوین کا دَور شروع ہوا، تو یہ بھی زبانی روایت سے۔ ایک نسل سے دوسری نسل میں منتقل ہوئے اور قرأت کے اختلاف نے اس میں پہلا فرق پیدا کیا۔ پھر نئے تصورت کے لئے پرانے لغات سے نئے معانی لیۓ گۓ اور نئے لغات کا اضافہ ہوا اس وقت ایک عملی دقت یہ تھی۔ فتحمند آریہ شودروں کی ناپاک زبان سے اپنے کام و دہن آلودہ نہیں کر سکتے تھے اور سنسکرت کی تقدیس نے اسے شودروں کے لیۓ شجرِ ممنوعہ بنا رکھا تھا لیکن لسانیات کے اٹل قوانین نے سنسکرت کی تقدیس کے قلعے کی بنیادوں کو ایسا مضبوط نہ رہنے دیا۔ جیسا آریہ سمجھتے تھے۔ اور آہستہ آہستہ دیسی عناصر میں سنسکرت کے کچھ الفاظ شامل ہونے لگے۔ یہ آریائی زبان کی تاریخ میں ایک نئے دور کا آغاز تھا۔

یہ دیسی عناصر کیا تھے یقین کے ساتھ ان کے بارہ میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ موہن جودارو کی تہذیب کا رسم الخط اور زبان اب تک ایک راز ہے جس دن اس کا انکشاف ہوگا، اس دن لسانیات کی تاریخ میں ایک نئے اور نہایت اہم باب کا اضافہ ہوگا۔ لیکن اس وقت تک ہم صرف اُن غیر آریائی زبانوں کو دیسی کہہ سکتے ہیں جو ہندوستان کے اصل باشندے آریوں کی آمد کے وقت بولتے تھے۔ اور جن کے آثار دکن میں دراوڑی خاندان کی زبانوں تامل۔ تلگو۔ ملیالم وغیرہ میں موجود ہیں شمالی ہند میں اس کا صرف ایک نمونہ ہے اور یہ بھی لسانیات کا ایک معمہ ہے۔ یہ بلوچستان کی بروہی یا براہوی ہے جو اسی نسل سے تعلق رکھتی ہے اور آج بھی فارسی الفاظ کی کثرت و آمیزش کے بعد اصول ساخت میں تامل اور تلگو سے قریب ہے۔ قیاس یہ ہے کہ آریوں کی یورش سے دراوڑی نسل کے بعض قبیلے بلوچستان کے دشوار گزار پہاڑوں میں روپوش ہو گئے اور ان کی اولاد آج تک اس ورثہ کو سینے سے لگائے ہے۔

ان دیسی عناصر اور سنسکرت کے آہستہ آہستہ ملاپ سے زبانوں کی جو صورت ہوئی۔ اس کے لیۓ ایک اصطلاحی نام پراکرت ہے۔ پراکرت کسی خاص زبان کا نام نہیں بلکہ سنسکرت کے مقابلہ میں مختلف علاقوں کی بولیوں کو پراکرت کہا گیا ہے۔ قدیم نحوی VARARUCHE کے بقول اس کی چار شاخیں قدیم ہیں۔ مگدھی۔ شورسینی۔ پیشاچی اور مہاراشٹری۔ مگدھی مگدھ کے علاقہ کی پراکرت تھی۔ لیکن جب گوتم بدھ نے اسے عوام کی زبان کی حیثیت سے اپنے عقاید کی اشاعت کے لیۓ اختیار کیا۔ اور خاص طور پر جب اشوک نے بدھ مذہب اختیار کر لیا تو اس زبان کو بڑا فروغ ہوُا۔ اسی طرح شورسینی کا مرکز برج یا متھرا کا علاقہ تھا جو برہمنوں کا ایک مضبوط گڑھ تھا۔ اور ان کے اثر و اقتدار کی وجہ سے شورسینی کا حلقۂ اثر بھی دلّی کے نواح تک پہنچ گیا تھا۔ ان پراکرتوں کا زمانہ پانچویں صدی ق۔م سے گیارھویں صدی عیسوی تک متعین کیا گیا ہے۔ مہاراشٹری پراکرت کو مہاراشٹر یا مرہٹہ واڑے سے تعلق نہیں۔ بلکہ یہ شمالی ہند کے ایک وسیع علاقہ میں پھیلی ہوئی بولی تھی۔ اور مہاراشٹر یہاں بڑے ملک کے معنوں میں استعمال ہوُا ہے۔

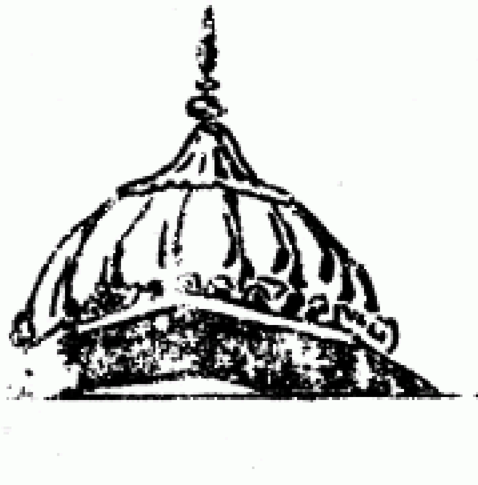
پراکرت کی ایک عوامی شکل تھی۔ جس کا نام اپ بھرنش تھا چنانچہ ورارُچی اسے الگ پراکرت تسلیم نہیں کرتا۔ بلکہ اسے دیش بھوشت کے نام سے یاد کرتا ہے۔ پراکرت کی طرح اپ بھرنش بھی اسم ذات نہیں ہے بلکہ ہر پراکرت کی عوامی شکل کو اس نام سے منسوب کیا گیا ہے۔ اور غالباً جس طرح مہاراشٹری شمالی ہند کے ایک بڑے علاقہ کی زبان تھی اسی طرح مہاراشٹری اپ بھرنش بھی وسیع ترعلاقے کی عوامی زبان تھی۔ دراصل اپ بھرنش کی یہی شکل برعظیم ہند و پاکستان کی موجودہ زبانوں کی پیش رو ہے۔ اور مسلمانوں کی آمد کے وقت شمالی ہند کے اکثر علاقے میں یہی بولی سمجھی اور بولی جاتی تھی۔ اس کے صرف و نحو سے بحث کرنے کا یہاں موقع نہیں لیکن بعض اشارے اس ثبوت میں پیش کئے جا

سکتے ہیں۔ کہ اس کا جدید ہند و پاکستانی زبانوں سے کیا تعلق ہے۔ اسم مذکر حالت فاعلی میں "O" "و" پر ختم ہوتا ہے۔ سندھی۔ گجراتی اور برج بھاشا میں یہی صورت ہے۔ جو الفاظ حالت فاعلی میں "A" "الف" پر ختم ہوتے ہیں۔ ان کی جمع "A" ان سے بنائی جاتی ہے۔ ضمائر میں امہے (ہمیں) تم اور تمہے (تمہیں) موجود ہیں۔ ماضی مطلق بنانے میں "یا" کا استعمال مثلاً کرنا۔ کیئا و۔ دکھنی دور تک اردو میں یہ صورت باقی تھی۔ رکھنا سے رکھیا۔ چلنا سے چلیا وغیرہ۔ پنجابی میں آج تک موجود ہے۔ دسنا۔ دسیا افعال میں ہوکھن میں "سی" صیغہ مستقبل کا لاحقہ ہے "ناہوسی" یعنی "نہ ہوگا"۔ "نہ دیکھسی" یعنی "نہیں دیکھے گا"۔ پنجابی میں یہ صیغہ ماضی ہے لیکن بعض علاقوں میں مستقبل کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔ اپ بھرنش میں اس کی دونوں شکلیں موجود ہیں۔ مثلاً ہیم چندر نے "ہوسی" استعمال کیا ہے لیکن "ہوہی" بھی موجود ہے۔ اس کے علاوہ بکثرت دیسی الفاظ جن کی اصلی صورت سنسکرت میں نظر نہیں آتی۔ اپ بھرنش میں صاف ملتے ہیں مثلاً رُم جھُم جو مرہٹی میں بھی اسی طرح استعمال ہوتا ہے۔ اپ بھرنش میں رمی جھیری ہے۔ جھگڑا اردو، مرہٹی اور گجراتی تینوں میں ہے۔ اپ بھرنش میں اس کی شکل "جھگڑنت" ہے۔ دھکہ بھی اپ بھرنش ہے۔ ماں سے بچّے کو الگ کرلیں تو "بڑکتا" ہے یہ لفظ بھی خالص اپ بھرنش ہے۔[۵]

غرض مسلمانوں کی آمد کے وقت شمالی ہند میں اپ بھرنش رائج تھی۔ اسی میں مسلمانوں کی لائی ہوئی فارسی یا فارسی میں دخیل عربی و ترکی کی آمیزش شروع ہوئی۔ قدرتی طور پر یہ آمیزش پہلے پنجاب میں۔ بعد ازاں ملتان و سندھ میں۔ پھر پنجاب اور دلّی کے درمیانی علاقے میں جسے ہریانی کا علاقہ کہتے ہیں۔ شروع ہوئی ہوگی۔ اس کے بعد یہ تبدیلی دلّی تک پہنچی ہوگی۔ اور وہاں سے گجرات اور دکن تک اس کا حلقہ عمل پھیل گیا ہوگا۔ اور ان تمام علاقوں میں مخصوص مقامی اختلافات سے ہٹ کر ایک عوامی شکل اپ بھرنش کی جگہ لے رہی ہوگی۔ مسلمانوں نے اسے پہلے ہندوی اور پھر ہندی کے نام سے یاد کیا ہے۔ اور اس زبان میں اُن کی جو تصانیف پنجاب۔ گجرات اور دکن کے علاوہ

میں لکھی گئیں۔ وہ صرف و نحو میں اس قدر ملتی جلتی ہیں۔ کہ ان کی مشترک اصل صاف نظر آتی ہے۔

اس کے بعد ہند۔ آریائی زبانوں کا ایک نیا دَور شروع ہوتا ہے اپ بھرنش کی مختلف مقامی شکلیں ایک دوسرے سے الگ ہو جاتی ہیں اور ترقی کرکے جدید ہندوستانی زبانوں مثلاً پنجابی۔ سندھی۔ گجراتی۔ مرہٹی بنگالی کی صورت میں ظاہر ہوتی ہیں۔ اور عوامی اپ بھرنش ہندوی اور ہندی کے دَور سے گزر کر اردو کا روپ حاصل کرتی ہے۔ اس اعتبار سے پہلی مرتبہ دکن میں اسے بولی سے نکل کر زبان کا مرتبہ حاصل ہوتا ہے اور دلّی سے بہت پہلے وہیں تالیف و تصنیف کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ ولی اپنے ساتھ اس کا پختہ نمونہ دہلی لاتے ہیں۔ اور شاہ سعد اللہ گلشن انہیں مشورہ دیتے ہیں۔ کہ تم اردوئے معلّیٰ کا محاورہ اختیار کرو۔ زبان کا لفظ انہوں نے استعمال نہیں کیا۔ کیونکہ ان کے نزدیک ولی کی زبان بنیادی حیثیت سے مختلف نہ تھی۔ صرف دکن کے محاورے کا فرق تھا۔ ولی نے اس مشورہ کو قبول کیا۔ اور اس دن سے اردوئے معلّیٰ کا محاورہ اردو کے لئے سند ٹھیرا۔ تاریخی و نیز لسانیاتی اعتبار سے اردوئے معلّیٰ اور اردو کے تعلق کا سلسلہ اس سے آگے نہیں پہنچتا ولی کے بعد زبان میں ایک ٹھیراؤ پیدا ہوا یعنی باعتبار ساخت اس کی ایک خاص شکل متعین ہوگئی۔ بعد میں جو تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ ان کا تعلق محاورے سے ہے۔ مثلاً دہلی اور لکھنؤ کے محاورہ کا فرق۔ کہ در اصل زبان میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے۔ اسی طرح اسالیب میں عہد بہ عہد جو ترقی ہوئی۔ اس سے بھی زبان کی ساخت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ یہ مسائل دراصل ایک دوسرے موضوع سے تعلق رکھتے ہیں۔ جو اس وقت ہماری بحث سے خارج ہے۔



۵ Proceedings of the first All India Conference - Apabhramsa by P. D. Gune - P169

عبداللطیف

شکسپیئر —— جولیس سیزر میں

(ادارہ "المنار" کا مضمون نگار کے نظریوں سے متفق ہونا ضروری نہیں —— مدیر)

ایک ادیب اپنی زندگی کے داخلی تجربات و محسوسات ذہنی و جذباتی کیفیات اور جمالیاتی تصورات کے ذریعہ نہ صرف اپنی بلکہ دوسروں کی زندگی کو بھی رنگین بنا دیتا ہے۔ وہ بیرونی دنیا میں صرف اس وقت آتا ہے۔ جب اسے اپنے داخلی تجربات کو پائیدار کرنے کی خواہش ہوتی ہے گو اسے بیرونی ماحول سے بھی اثرات لینا پڑتے ہیں۔ مگر وہ قومی۔ ملی یا سوشل زندگی میں بھی اپنے مخصوص انداز۔ اور زاویہ نگاہ کو ساتھ لے کر آتا ہے۔ وہ اپنی منفرد صلاحیتوں اور مخصوص انداز فکر سے زندگی کے ان حقائق کو دیکھ لیتا ہے۔ جو عوام کی نظروں سے اوجھل ہوتے ہیں۔ اس کا سب سے بڑا کام انسانی زندگی کے ہمہ گیر محسوسات اور فطرت انسانی کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد ان میں حسن پیدا کرنا ہے۔ وہ صرف زندگی کی عکاسی یا تنقید پر ہی اکتفا نہیں کرتا۔ بلکہ انتخاب تنظیم اور ترتیب کے علاوہ جدت طرازی، معنی خیزی اور رنگ آفرینی بھی کرتا ہے۔ ارسطو میتھیو آرنلڈ۔ کروچے۔ آسکر وائلڈ۔ لینن یا فرائڈ وغیرہ میں سے کوئی بھی اس امر سے انکار نہیں کر سکتا۔ کہ ادب میں ادیب اپنے ایسے داخلی تجربات۔ محسوسات۔ جذبات اور نظریات کو پیش کرتا ہے۔ جو اس کے اور صرف اس کے ہوتے ہیں۔ پڑھنے والے کا اگر تعلق ہے تو محض اتنا کہ وہ ادب میں ادیب کو اور پھر اس کی ذات میں خود کو پا لینے کی کوشش کرتا ہے۔ اس لئے ادب کو آپ بیتی کی ایسی منتخب، مرتب اور منظم صورت کہنا چاہیئے۔ جسے خوش اسلوبی سے پیش کیا گیا ہو۔

اب میں ان نظریات کی روشنی میں شکسپیئر کے ڈرامہ "جولیس سیزر" کو دیکھنے کی کوشش کروں گا۔

ڈرامہ کی ابتدا اس طرح کی گئی ہے۔

"پومپئی" کے قتل کے بعد "سیزر" روم میں واپس آتا ہے۔ اسی اثنا میں عوام بھی جشن منا رہے ہوتے ہیں۔ پھر فلاوئیس FLAU VIUS (ایک کردار) اور اس کے ساتھی لوگوں کو جشن منانے سے منع کرتے ہیں۔ اس کی وجہ "سیزر" کا ان کے منظور نظر بادشاہ "پومپئی" پر ظلم و تشدد بتائی جاتی ہے۔ لوگ اپنے گھروں کو روانہ ہوتے ہیں۔ پھر جب وہ دوست جشن پر تبصرہ کرتے ہیں تو بعض اسے مذہبی تہوار قرار دیتے ہیں۔ اس کے بعد لوگ جب "سیزر" کو تاج پہنانے لگتے ہیں۔ تو وہ پہننے سے انکار کر دیتا ہے۔ لوگ تالیاں بجاتے ہیں جس پر اسے غصہ آجاتا ہے اور وہ واپس گھر کو روانہ ہو جاتا ہے۔ عین اسی وقت "BRUTUS" بروٹس کیسی اس "CASSIUS" اور ان کے ساتھی (جنہیں ڈرامہ میں سازشیوں سے موسوم کیا گیا ہے) لوگوں کے نعروں اور "سیزر" کے تاج سے انکار پر تبصرہ کرتے ہیں۔ یہاں پر ڈرامہ نگار نے ان تمام تبصروں کو جمع کر دیا ہے جو اصل واقعہ کے متعلق تاریخ میں مذکور تھے۔ پھر بروٹس اور کیسی اس میں گفتگو ہوتی ہے۔ اس میں کیسی اس کی ذاتی دشمنی اور بروٹس کی عوام دوستی کا اظہار کیا گیا ہے۔ وہ سازش کرتے ہیں اور سیزر کو قتل کر کے اس کے دست راست "انوٹنی" کو اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کرتے ہیں —— "انوٹنی" ان سے وعدہ کرتا ہے۔ کہ وہ عوام کے مشتعل جذبات کو فرو کرے گا۔ مگر سٹیج پر ان کے خلاف تقریر شروع کر دیتا ہے۔ جس میں وہ فرضی وصیت نامہ سے "سیزر" کی رعایا پروری کا اظہار کرتا ہے اس سے عوام سازشیوں کے خلاف ہو جاتے ہیں۔ پھر "انوٹنی" اور "بروٹس" کی فوجوں میں جنگ ہوتی ہے۔ "بروٹس" کو "سیزر" کے قتل پر گناہ کا احساس ہوتا ہے۔ اس لئے اسے اپنی شکست اور سزا کا یقین ہو جاتا ہے۔ اور چھوٹی سی شکست پر ہار مان کر وہ خودکشی کر لیتا ہے اس کے ساتھی "کیسی اس" کا بھی یہی حشر ہوتا ہے۔ اور ڈرامہ ختم ہو جاتا ہے۔

اس ڈرامہ کی سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ ہمیں "جولیس سیزر" کے متعلق شکسپیئر کی ذاتی رائے اور اس کا اپنا زاویہ نگاہ بالکل

معلوم نہیں ہوتا۔ پہلے سین میں لوگوں کے جشن اور دوسرے سین میں سیزر کی تاجپوشی سے انکار پر لوگوں کی تالیاں اور شور و غوغا کے ذکر میں اس نے ذاتی تاثر کے اظہار کی بجائے ان تمام تبصروں کو جمع کرنے پر اکتفا کی ہے جو مختلف مؤرخوں نے اصل واقعہ پر کئے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ ڈرامہ ہمہ گیر انسانیت سے بھی عاری ہے۔ یہ سیاسی اور تاریخی ڈرامہ صرف اس صورت میں لکھا جا سکتا تھا جب رائے عامہ اس کے ہیرو کے حق میں ہوتی یا کم از کم پڑھنے والا اس کے ان تمام افعال کو جائز سمجھ سکتا۔ جو اس کی موت کا باعث ہوئے۔ مگر شروع سے لیکر اس کی موت تک پڑھنے والے کو اس کے ساتھ کہیں بھی ہمدردی پیدا نہیں ہوتی۔ بلکہ ہر جگہ یہ احساس ہوتا ہے کہ اس کا کردار "بروٹس" (BRUTUS) کی زندگی کے اتار چڑھاؤ کو ظاہر کرنے کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ جولیس سیزر جیسا کہ ڈرامہ کے ہر سین سے ظاہر ہوتا ہے جمہوریت کے خلاف تھا۔ وہ شخصی اقتدار کا بھوکا تھا۔ اس نے عوام کی آزادی کو سلب کر رکھا تھا جس کا صرف عوام کو ہی نہیں بلکہ خود اسے بھی احساس تھا۔ گو کیسیس کو اس کے ساتھ ذاتی دشمنی تھی۔ مگر بروٹس اور اس کے علاوہ اکثر سیاسی لیڈر اس کی حکومت کو اہل روم کی غلامی سمجھتے تھے۔ اس کے مقابلہ میں "بروٹس" کو لوگوں کی بہبود کا اتنا خیال تھا کہ اس نے سیزر کے قتل کو اپنا مقصدِ اولین بنا کر کسی قسم کے خطرے کی پرواہ نہیں کی۔ زندگی کے دشوار گزار لمحات میں بھی اس نے اپنی انسانیت اور اخلاقی جرأت یا انسان دوستی کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ اب ان تمام باتوں کو نظر انداز کر کے صرف ایک وصیت نامے یا بروٹس کے احساسِ گناہ کے ذریعہ ڈرامہ کو بالکل بدل دینا بھلا کیونکر جائز ہو سکتا ہے؟ حالانکہ ایکٹ نمبر ۳ کے پہلے سین میں "انٹونی" کی "خود کلامی" سے صاف ظاہر ہے کہ وصیت نامہ اس کے اپنے ذہن کی پیداوار ہے۔ پھر بروٹس کو احساسِ گناہ یاد دیوتاؤں کی آفت کا ڈر کیوں ہوا؟ اگر وہ رائے عامہ سے متاثر ہو کر (جیسا کہ ڈکن وغیرہ کا خیال ہے) سیزر اور انٹونی کی برائیوں پر یقین رکھتے ہوئے بھی اپنے لئے وجہ جواز پیدا نہیں کر سکا۔ تو پھر اس ڈرامہ کو "سیزر" کی بجائے بروٹس کی ٹریجڈی بننا چاہیے تھا۔

اس کے علاوہ ڈرامہ کا ہر حصہ دوسرے حصوں سے بالکل جدا ہے مصنف انہیں ملا کر وحدتِ تاثر پیدا نہیں کر سکا۔ جزئیات میں کوئی توازن نہیں۔ اکثر غیر ضروری حصوں کو اتنی اہمیت دی گئی ہے کہ انہوں نے ضروری حصوں کو مبہم اور غیر واضح بنا دیا ہے۔

نیم پاگل یا مسخرے (FOOL) کے کردار کو اس وقت پیش کیا گیا جب وہ ایک لمحے کے لئے بھی توجہ کا مرکز نہیں بن سکتا تھا۔

عورت کے کردار سے (جس سے غرض بروٹس کے اپنے جذبات پر قابو رکھ سکنے کا اظہار تھا) ایسی باتیں کروائی گئی ہیں جن کا ڈرامہ کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ سیزر کی وفات پر عوام کے اشتعال کو اس انداز میں پیش کیا گیا ہے اور اسے اس قدر طوالت دی گئی ہے کہ عوام کے تلونِ طبع کا اظہار اس ڈرامہ کا اصل مقصد معلوم ہوتا ہے۔

مجموعی تاثر کے اعتبار سے یہ مصنف کی ایک ایسی ذہنی کاوش ہے جس میں مختلف مؤرخوں کے تبصروں کو ایک غیر منظم اور بے ہنگم طریقہ سے پیش کیا گیا ہے۔ دراصل ڈرامہ نگار داخلی و خارجی اور ذہنی و جذباتی تقاضوں میں توازن پیدا نہیں کر سکا۔ اس کا قلم اسے بروٹس کی طرف کھینچتا رہا۔ اور ماحول کی آواز سیزر کی جانب جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے اپنے جذبات سے مغلوب ہو کر بروٹس کے کردار کو اتنا واضح کر دیا کہ باقی تمام کردار (خود جولیس سیزر بھی) اس کے گرد گھومنے لگے۔ اور اس کمی کو اس نے وصیت نامہ یا بروٹس کے احساسِ گناہ سے پورا کر کے تمام ڈرامہ کو بے کیف بنا دیا۔ ڈرامہ نگار نے خود نہ تو ان باتوں کو محسوس کیا۔ اور نہ وہ اپنی تخلیق کے ساتھ مخلص ہے۔ اس نے اپنی داخلیت کو ماحول کی آواز پر قربان کر دیا اور اس کی وجہ سے شروع سے آخر تک وہ ذہنی و جذباتی۔ نیز شعوری و لاشعوری کش مکش میں مبتلا رہا ۔

زندگی کی عکاسی

"ادب بہرحال انسانوں کے درمیان رہ کر پیش کیا جاتا ہے اس لئے ادیب کا انسانوں سے دلچسپی لینا ناگزیر ہے۔ جب وہ خود بھی ایک انسان ہے اور اس کی زندگی بھی انسانوں کے درمیان بسر ہو رہی ہے۔ تو پھر یہ کس طرح ممکن ہے کہ وہ اپنے اور ان کے جذبات و احساسات کے مد و جزر۔ حالات و واقعات کے تلاطم اور زندگی کی مختلف کروٹوں کو اپنی تخلیقات میں سمونے سے باز رہے"

تنقیدی زاویے صفحہ ۳۲

(از ڈاکٹر عبادت بریلوی)

سمیع اللہ قریشی تاثیر

سفر

ترے جہانِ الم کا نہیں ہوں شیدائی
افق کے پار بہت دور بھاگ جانے دے
جہاں پہ مجھ کو میسّر ہو کنجِ تنہائی!
وہاں پہ جا کے مجھے اپنا راگ گانے دے

ترے جہانِ الم کا یہ شورِ آہ و فغاں
کروں گا میں اسے برداشت، کون کہتا ہے
کسے پتہ ہے کہ کیا ہے یہ میرا سوزِ نہاں
کسی کا درد یہاں آج کون سہتا ہے

جو ہو سو ہو مجھے معلوم ہے مرا انجام
تو پھر میں کیوں نہ تمہیں چھوڑ کر چلا جاؤں؟
مجھے یقیں ہے میں پاؤں گا کوئی ایسا مقام
جہاں سے جا کے میں خوشیوں کو پھر بلا لاؤں

مجھے حیات پہ اپنی کچھ اعتبار نہیں
جو یاد آؤں تو جی بھر کے مجھ پہ رو لینا
میں جا رہا ہوں بظاہر کوئی اشکبار نہیں
مگر یہ خون کے آنسو مرے پرو لینا

مرا سلام سرِ شام دو ستاروں سے
خبر یہ اس لئے ان کو سنا رہا ہوں میں
کہ ہو رہا ہوں جدا آج اپنے پیاروں سے
افق کے پار بہت دور جا رہا ہوں میں

پروفیسر صوفی عبدالعزیز ایم اے

پنجاب یونیورسٹی کا فیلو بننے پر
جناب مرزا ناصر احمدؐ ایم اے (آکسن) کی خدمت میں

ہدیۂ تہنیت

صاحب الاعجاز "مرزا ناصر احمد"! آپ کو
جان و دل سے "ہدیۂ تبریک" دیتے ہیں سبھی
منتخب "فیلو" ہوئے ہیں آپ۔ پرشاداں ہیں ہم
آپ کی "ہر شان" سے دل میں ہمارے ہے خوشی
کیوں مسرت ہے نہ ہم بھولیں کہ ہے اک "وصفِ خاص"
جس سے واضح "ہمسروں" پہ آپ کی ہے "برتری"
ان میں "ایم اے آکسن" اور "ایم اے کنٹب" ہیں ضرور
پر سوائے آپ کے "قرآں کا حافظ" ہے کوئی
اب "مسائل" کا کوئی گوشہ ہو تاریکی میں کیوں!
"مشعلِ شرق و غرب" جب "بزم" میں روشن ہوئی
نصرتِ یزداں ہو شامل آپ کے ہر حال میں
آپ کے دم سے بنے یہ "پاک" "یونیورسٹی"

پروفیسر بشارت الرحمٰن ایم اے

حضرت رسولِ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی ذاتِ بابرکات پر ★ فرائڈ اور اُن کے ہمنواؤں کے اعتراضات کی حقیقت ★

مغربی محقّقین جب اسلام اور قرآن کریم کا علمی رنگ میں مطالعہ کرتے ہیں تو ان کی آنکھیں اس انقلاب کو دیکھ کر ششدر رہ جاتی ہیں جو اسلام کے ذریعہ ظہور میں آیا جب وہ قرآن کریم پر غور کرتے ہیں۔ تو اس کی اعلیٰ اخلاقی تعلیم۔ بیان کی پاکیزگی اور توحید باری کی تفصیلات ان کے ذہنوں پر خاص طور پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ اور اُن کے دل میں طبعاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ عرب کے ایک گمنام شخص کے ذریعہ سے یہ معجزہ کیسے ظاہر ہوا۔ کہ اس نے اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کی صفات بالخصوص توحید کے متعلق اتنی پاکیزہ اور واضح تعلیم دنیا کے سامنے پیش کی جس کی مثال ان کے مسلّمہ انبیاء کی تعلیمات میں مفقود ہے۔

اس سوال کا جواب واضح ہے۔ پہلے نبی بھی توحید کی تعلیم لے کر آئے۔ انہوں نے بھی اللہ تعالیٰ کی صفات اور ان کے ظہور پر بحث کی مگر ان کے ظہور کا زمانہ وہ تھا جبکہ انسان ذہنی طور پر بلوغت کو نہیں پہنچا تھا پہلے انبیاء شریعت کے ارتقاء کی زنجیر میں ابتدائی کڑیوں کی حیثیت رکھتے تھے۔ آخر وہ زمانہ آیا جب انسان اپنی ذہنی بلوغت کو پہنچ گیا۔ اور اس قابل ہوگیا۔ کہ توحید باری کے سب راز پوری تفصیل کے ساتھ اُس کے سامنے رکھ دئے جائیں۔ خدا تعالیٰ کے قرب کے سب ذرائع ایک ایک کرکے اُسے بتا دئے جائیں اور شرک کا پورے زور سے قلع قمع کر دیا جائے تب اللہ تعالیٰ نے اس رسول کو مبعوث فرمایا جس پر کمالات نبوت ختم ہوتے تھے اور اسے ایسی تعلیم دی جو ہر قسم کے عیوب سے مبرّا تھی جس نے شریعت اور طریقت کے تمام راز افشا کر دئے۔ اس تعلیم میں گزشتہ انبیاء کی تعلیمات کے تمام وہ اجزاء شامل تھے جو تمام زمانوں کے لئے دائمی طور پر افادیت کا پہلو لئے ہوئے تھے۔ اس سے گزشتہ تعلیمات کے زوائد کو ہٹا دیا گیا۔ اور ہر قسم کی پیچیدگیوں کو دور کرکے ایک صراطِ مستقیم دنیا کے سامنے پیش کر دیا گیا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے۔ فِيهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ۔ یعنی ہر قسم کی مفید اور قائم رہنے والی تعلیم قرآن کے اندر موجود ہے۔

مغربی محقّقین ایک طرف جب اسلام کی تعلیم اور اس کے اثرات پر غور کرتے ہیں۔ تو ان کی فطرت بول اٹھتی ہے۔ کہ واقعی یہ ایک عظیم الشان معجزہ تھا۔ جو رونما ہوا۔ دوسری طرف تعصّب کی وجہ سے وہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کو نبی برحق نہیں ماننا چاہتے۔ اس لئے وہ اس عظیم الشان معجزہ کی علمی توجیہات سوچتے ہیں۔ تا انہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کی نبوّت حقّہ کا اقرار بھی نہ کرنا پڑے اور علمی دنیا کو علمی طور پر وہ مطمئن بھی کر دیں۔ چنانچہ اس غرض کے لئے یورپ کے بعض ماہرین نفسیات کی طرف سے اسلام کے متعلّق ایک نظریہ یہ پیش کیا جاتا ہے کہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نعوذ باللہ ایک ذہنی مریض تھے۔ آپ کی ذہنی الجھن MOTHER FIXATION اور FATHER HATRED تھی یعنی آپ نعوذ باللہ والدہ کے لئے جنسی میلان رکھنے کی وجہ سے باپ کو اپنا رقیب سمجھتے تھے۔ اور اس وجہ سے آپ کے تحت الشعور میں آباء سے نفرت کا جذبہ کارفرما تھا۔ اور اس جذبے کے تحت آپ کی طبیعت میں ABNORMALITY یعنی ایک غیر متوازن کیفیت پیدا ہوگئی تھی۔ آخر یہ غیر معمولی کیفیت اس قدر بڑھی کہ یکدم ایک زلزلہ کی صورت میں اس کا ظہور ہوا۔ اس کے زیر اثر آپ نے نہایت شدّومد سے اپنے آباء و اجداد کے خیالات و معتقدات کی مخالفت کی۔

تعصّب کا بُرا ہو۔ ان ماہرین نفسیات کو آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کے اندر ایک غیر معمولی کیفیت تو نظر آتی ہے۔ اور وہ یہ بھی دیکھتے ہیں کہ اس غیر معمولی کیفیت سے غیر معمولی نتائج نکلے مگر بجائے اس کے کہ وہ منہاج نبوّت کے مطابق ان امور کو آپ کے مامور من اللہ ہونے کا ثبوت قرار دیتے۔ انہوں نے فرض کر لیا۔ کہ یہ غیر معمولی جوش جو آپ کے اندر کارفرما تھا۔ ایک ذہنی بیماری کا لازمی نتیجہ تھا۔ اور چونکہ آپ نے باپ دادا کے مذہب کے خلاف تعلیم دی۔ اس لئے آپ کے تحت الشعور میں FATHER — HATRED

کا مخفی جذبہ کارفرما تھا جس کی بناء پر آپ کو والدہ کی طرف جنسی میلان رکھنے والی ذہنی بیماری لاحق تھی (نعوذ باللہ من ذالک نقل کفر کفر نباشد)

ان معترضین کو سب سے پہلے یہ جواب دیا جاتا ہے کہ اگر اس طریق سے نتائج اخذ کرنا جائز قرار دے دیا جائے۔ تو دنیا میں اندھیر مچ جائے۔ یونیورسٹی میں ایک طالب علم سائنس کا کوئی نیا اصول دریافت کر لیتا ہے جس سے پہلے سائنس دانوں کے نظریئے غلط ثابت ہوجاتے ہیں، تو اس کی غیر معمولی قابلیت پر یونیورسٹی اسے انعامی تمغہ دیتی ہے۔ اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لئے اسے حکومت کی طرف سے وظیفہ دیا جاتا ہے اس کے ماں باپ خوشی کا اظہار کرتے ہیں، دوست اسے پھولوں کے ہار پہناتے ہیں اور اس کی غیر معمولی کامیابی پر اسے مبارکباد دیتے ہیں مگر ان ماہرین نفسیات کے نزدیک یہ تمام کام لغو ٹھہرے۔ ان کے نزدیک اس طالب علم نے غیر معمولی ذہانت کا مظاہرہ اس لئے نہیں کیا تھا۔ کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسے اعلیٰ دماغ عطا ہوا۔ اور اس نے اپنی اعلیٰ طاقتوں کا بہترین استعمال کر کے انہیں جلادی۔ اور اس کے ثمرات سے متمتع ہوا تھا۔ بلکہ بقول "ماہرین نفسیات" اس غیر معمولی کیفیت قابلیت کا مظاہرہ اس طالب علم نے اس لئے کیا تھا۔ کہ وہ ایک ذہنی مریض تھا وہ تحت الشعور میں اپنی ہمشیرہ یا والدہ سے ناجائز طور پر جنسی میلان رکھتا تھا۔ اس لئے آباء و اجداد کے خیالات سے منحرف ہوا۔ اس لئے ان کے نزدیک اسے کوئی تمغہ یا انعام نہیں ملنا چاہیئے۔ اس کی اعلیٰ کامیابی ہرگز قابل مبارکباد نہیں بلکہ ایسے طالب علم کو گولی سے اڑا دینا چاہیئے؛ کیونکہ وہ ایک گندہ چوہا ہے جس کے تحت الشعور میں ایک ناپاک مرض مضمر ہے۔ یا ایسے شخص کو فوراً جلا وطن کر دینا چاہیئے۔ تا قوم اس کے گند سے محفوظ رہے۔ یہ وہ لازمی نتیجہ ہے جو ڈاکٹر فرائڈ اور ان کے ہمنواؤں کے مندرجہ بالا طریق استدلال کو تسلیم کرنے سے پیدا ہوتا ہے ظاہر ہے کہ عقل سلیم اس نتیجہ کو رد کر دیتی ہے۔ افسوس کہ یہ لوگ اپنی من گھڑت تھیوریوں کی بناء پر اللہ تعالیٰ کے مقدسین پر کیچڑ اچھالنے سے بھی باز نہیں رہتے۔

ڈاکٹر فرائڈ وغیرہ کے یہ نظریئے ان کے اپنے ماحول کے آئینہ دار ہیں۔ یورپ کا اخلاقی ماحول حد درجہ پست ہے مگر افسوس ہے کہ ان لوگوں نے اپنی ناپاک سوسائٹی کے رجحانات کو ساری دنیا پر چسپاں کرنے اور اسی کے مطابق اللہ تعالیٰ کے انبیاء کو پرکھنے کی کوشش کی ہے۔

مندرجہ بالا اعتراض سے اس کے علاوہ یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے۔ کہ یہ ماہرین نفسیات اسلام اور عرب کی تاریخ سے اصلاً ناواقف ہیں۔ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تحت الشعور میں نعوذ باللہ من ذالک FATHER HETRED کا جذبہ کارفرما تھا اور آپ کی تعلیم اور ظہور قرآن اسی کا نتیجہ تھے۔ تو چاہیئے تو یہ تھا۔ کہ آپ باپ دادا کی ہر بات کی مخالفت کرتے مگر اس کے برعکس ہم دیکھتے ہیں کہ ان ماہرین نفسیات کے اقوال کے برعکس آپ نے باپ دادا کے سب عقائد کی تردید نہیں کی صرف ان باتوں کی مخالفت فرمائی جو عقل سلیم اور حقیقت کے خلاف تھیں۔ گویا آپ نے غلطیوں کی اصلاح فرمائی جو کہ انبیاء اور رسل کا کام ہے۔ نمونہ کے طور پر یہاں چند ایسے امور کا ذکر کیا جاتا ہے۔ جن پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے باپ دادا ایمان رکھتے تھے اور آنحضرت نے انکی پرزور تائید فرمائی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کی ذات پر ایمان لانے کے عقیدہ کو بڑے زور شور کے ساتھ دنیا کے سامنے رکھا۔ زمانہ جاہلیت کے عرب اور آپ کے آباء و اجداد مشرک تھے مگر وہ اللہ تعالیٰ کی ذات کو مانتے تھے اور اس پر ایمان رکھتے تھے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے افعال اور صفات میں بتوں وغیرہ کو شریک مانتے تھے مگر خالق کائنات صرف اللہ تعالیٰ ہی کو گردانتے تھے۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا کے زمانہ میں ابرہہ بادشاہ نے جب یمنی اور حبشی فوج کے ساتھ خانہ کعبہ کو گرانے کے لئے مکہ پر حملہ کیا تو آپ کے دادا بادشاہ کو ملنے گئے۔ بادشاہ ان کی فراست اور عقل مندی سے بہت متاثر ہوا۔ اس نے کہا۔ فرمایئے آپ کیا چاہتے ہیں۔ حضرت عبدالمطلب نے فرمایا۔ آپکے سپاہیوں نے میرے اونٹ پکڑ لئے ہیں میں غریب آدمی ہوں۔ میرے اونٹ ولوا دیجئے۔ اس پر بادشاہ حیران رہ گیا۔ اور کہنے لگا کہ میں آپکو عقلمند سمجھتا تھا میں خانہ کعبہ کو گرانے کیلئے آیا ہوں۔ آپکو اس کی فکر نہیں اپنے اونٹوں کی فکر ہے۔ اس پر عبدالمطلب نے کہا۔ اَنَا رَبُّ الْاِبِلِ وَلِلْبَیْتِ رَبٌّ یَمْنَعُہٗ۔ کہ اے بادشاہ میں اونٹوں کا مالک ہوں مجھے ان کی ہی فکر ہونی تھی۔ اس گھر کا مالک کوئی اور ہے اس کی حفاظت وہ خود کریگا۔ اب دیکھئے عبدالمطلب کا اللہ تعالیٰ کی ذات پر کس قدر پختہ ایمان تھا جس کی مثال عام مومنوں میں بھی کم ملتی ہے۔ اتنی بڑی مصیبت کے موقعہ پر انہیں اللہ تعالیٰ پر اس قسم کا عظیم الشان توکل تھا۔ اور اس کی

حمایت ونصرت پر اس قدر ایمان تھا۔ اگر ان ماہرین نفسیات کی بات میں ذرہ بھر بھی صداقت ہوتی تو چاہیئے تو یہ تھا کہ اسلام کی تعلیم نعوذ باللہ دہریت سے پر ہوتی جس میں خدا تعالیٰ کی ذات کی تردید کی جاتی۔ کیونکہ آپ کے باپ دادا تو خدا تعالیٰ پر ایمان رکھتے تھے۔ قرآن کریم سے بھی یہ ثابت ہے کہ زمانہ جاہلیت کے عرب اللہ تعالیٰ کی ذات پر ایمان رکھتے تھے مثلاً

ا۔ سورۃ الزمر میں اللہ تعالیٰ کفار کے قول کو نقل فرماتا ہے۔ کہ
مَا نَعْبُدُهُمْ إِلَّا لِيُقَرِّبُونَا إِلَى اللَّهِ زُلْفَىٰ
(الزمر رکوع ۱)
کہ ہم ان معبودوں کی اس لئے پرستش کرتے ہیں کہ یہ ہمیں اللہ تعالیٰ کے قریب کر دیتے ہیں۔

(ب) اسی طرح سورۃ یونس رکوع ۳ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جب یہ لوگ سمندر کے طوفان میں گھر جاتے ہیں، چاروں طرف سے امواج ان پر چڑھ آتی ہیں۔ بچنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ تو دَعَوُا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ۔ یہ لوگ صرف اللہ تعالیٰ کو پکارتے ہیں اور اس وقت اپنی دعا کو صرف اللہ تعالیٰ کے لئے خالص کر دیتے ہیں۔

مندرجہ بالا آیت سے ثابت ہے کہ کفار مصیبت کی اشد ترین گھڑیوں میں صرف اللہ تعالیٰ کی ذات کو ہی حقیقی نجات دہندہ تصور کرتے تھے

(ج) اسی طرح سورۃ الانعام رکوع ۴ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔
قُلْ أَرَأَيْتَكُمْ إِنْ أَتَاكُمْ عَذَابُ اللَّهِ أَوْ أَتَتْكُمُ السَّاعَةُ أَغَيْرَ اللَّهِ تَدْعُونَ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ. بَلْ إِيَّاهُ تَدْعُونَ فَيَكْشِفُ مَا تَدْعُونَ إِلَيْهِ إِنْ شَاءَ وَتَنْسَوْنَ مَا تُشْرِكُونَ ۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ اے رسول تو کہہ کہ اگر تم اپنے دعویٰ میں سچے ہو تو بتاؤ تو سہی کہ اگر تمہارے پاس اللہ تعالیٰ کا عذاب آجائے یا تباہی کی گھڑی تمہارے سامنے آجائے تو کیا تم اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کو پکارتے ہو۔ ہرگز نہیں بلکہ تم صرف اسی کو پکارتے ہو۔ پس وہ اس مصیبت کو جس کے لئے تم اسے پکارتے ہو اگر چاہے تو دور کر دیتا ہے اور اس وقت تم اپنے بتوں اور شریکوں کو بھول جاتے ہو۔ اب دیکھیں بعینہٖ یہی تعلیم اسلام کی ہے کہ ہر مصیبت کو دور کرنے کیلئے خدا تعالیٰ ہی سے التجا کرنی چاہیئے۔

(۲) اس امر کی دوسری مثال کہ اسلام نے جاہلیت کی اچھی رسوم اور اچھے عقائد کو برقرار رکھا عزت والے مہینوں کی ہے۔ جاہلیت میں بارہ مہینوں میں سے چار مہینے ذی قعدہ۔ ذی الحجہ، محرم اور رجب اشہر الحرم کہلاتے تھے۔ ان مہینوں میں لڑائی ممنوع سمجھی جاتی تھی۔ اسلام نے بھی ان چار عزت والے مہینوں کی حرمت کو برقرار رکھا۔

(۳) تیسری مثال یہ ہے کہ جاہلیت میں عرب خانہ کعبہ کی تعظیم کرتے تھے اسے البیت الحرام سمجھتے تھے۔ قرآن کریم میں بھی اللہ تعالیٰ نے اعلان فرمایا ہے کہ جَعَلَ اللَّهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قِيَامًا لِلنَّاسِ وَالشَّهْرَ الْحَرَامَ وَالْهَدْيَ وَالْقَلَائِدَ (المائدہ رکوع ۳) یعنی اللہ تعالیٰ نے ہی خانہ کعبہ کو البیت الحرام اور قیاما للناس یعنی لوگوں کیلئے سہارے کا موجب مقرر کیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے ہی عزت والے مہینے کی حرمت کو قائم کیا ہے اور الھدی یعنی قربانی کے جانور اور وہ جانور جن کے گلوں میں کلادہ ڈالا جاتا ہے یہ سب چیزیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہی مقرر ہیں؛

(۴) اس سلسلے میں اب میں صرف ایک اور مثال قارئین کے سامنے رکھتا ہوں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا طریق یہ تھا کہ جب تک کسی معاملے میں آپ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت نہ ملتی۔ اسوقت تک آپ اس کے متعلق خاموشی اختیار کرتے۔ اگر آپ کے دل میں آباؤ اجداد کی مخالفت کا جذبہ موجزن تھا تو کیا وجہ ہے کہ پہلے آپ پرانے طریق عمل کو درست قرار دیتے ہیں یا کم از کم اسکی تردید نہیں کرتے۔ اور بعد میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والی ہدایت آپکو اپنے مقام پر قائم نہیں رہنے دیتی مثلاً زمانہ جاہلیت میں ایک رسم تھی کہ اگر ایک مرد اپنی بیوی کو ماں کہہ دیتا تو اسکا ایسا کہنا ایک قسم کی طلاق کا رنگ رکھتا۔ اسکے بعد وہ بیوی اس مرد کیلئے ماں کی طرح حرام ہو جاتی اور میاں بیوی تعلقات زوجیت قائم نہ رکھ سکتے۔ اس رسم کا نام ظہار تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ایک مسلمان نے اپنی بیوی سے یہ سلوک کیا مگر بعد میں نادم ہوا۔ رواج کے مطابق اب وہ اسے اپنی بیوی نہ سمجھ سکتا تھا اب اسکے لئے لازم تھا۔ کہ اپنی غلطی کا خمیازہ بھگتتا۔ وہ عورت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور سارا قصہ سنایا۔ آپ نے فرمایا۔ کہ اب تمہارے درمیان

جدائی ہو جانی چاہیئے۔ تم دونوں آپس میں تعلقات زوجیت کو قائم نہیں رکھ سکتے۔ اس پر وہ عورت آپ سے بحث کرنے لگ گئی۔ کہ ایسا نہیں ہونا چاہیئے مگر آپ اپنی بات پر مُصر رہے۔ خدائے علیم وخبیر نے اس بحث کو سنا اور اس کے متعلق اپنے نبی سے یوں فرمایا۔ قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّتِیْ تُجَادِلُكَ فِیْ زَوْجِهَا وَ تَشْتَكِیْٓ اِلَى اللّٰهِ ۖ وَاللّٰهُ يَسْمَعُ تَحَاوُرَكُمَا ۚ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ ۔ اَلَّذِيْنَ يُظٰهِرُوْنَ مِنْكُمْ مِّنْ نِّسَآئِهِمْ مَّا هُنَّ اُمَّهٰتِهِمْ ۭ اِنْ اُمَّهٰتُهُمْ اِلَّا الّٰٓـِٔيْ وَلَدْنَهُمْ ۭ وَاِنَّهُمْ لَيَقُوْلُوْنَ مُنْكَرًا مِّنَ الْقَوْلِ وَزُوْرًا ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ لَعَفُوٌّ غَفُوْرٌ ۔ (سورہ المجادلہ)

یعنی اللہ تعالیٰ نے اس عورت کی بات کو سن لیا جو اپنے خاوند کے بارے میں تجھ سے جھگڑ رہی تھی اور اللہ تعالیٰ کے حضور شکایت کر رہی تھی اللہ تعالیٰ تم دونوں کی بحث کو سن رہا تھا۔ اور اللہ تعالیٰ سننے والا اور دیکھنے والا ہے وہ لوگ جو اپنی عورتوں سے ظہار کرتے ہیں (انہیں یاد رکھنا چاہیئے) کہ وہ ان کی مائیں نہیں ہیں۔ ان کی مائیں صرف وہی ہیں جنہوں نے ان کو جنا اور (ایسا کہنے والے) یقیناً ناپسندیدہ اور جھوٹی بات کہتے ہیں اور اللہ تعالیٰ معاف کرنے والا اور بخشنے والا ہے اب دیکھیئے۔ جہاں تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اپنے خیالات کا تعلق ہے آپ نے جاہلیت کی رسم کو برقرار رکھا بعد میں اللہ تعالیٰ کی وحی نے اس کی تردید کر دی۔ اگر تحت الشعور میں آپ کے اندر باپ دادا کے خلاف بغاوت کا جذبہ موجزن ہوتا۔ تو لامحالہ ہر امر میں آپ ان کی بات کی شروع ہی سے مخالفت فرماتے۔

مندرجہ بالا مثالوں سے یہ امر واضح ہے کہ ڈاکٹر فرائڈ اور ان کے ساتھی جنہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ ناپاک اتہام لگایا ہے۔ عرب کی تاریخ سے بالکل نابلد ہیں۔ انہیں منہاجِ نبوت کا علم نہیں اگر انہیں منہاج نبوت کا علم ہوتا تو انہیں معلوم ہو جاتا۔ کہ اسلامی تعلیم کی بنیادی باتیں تو وہی ہیں جن پر تمام راستباز ہمیشہ سے زور دیتے چلے آئے تھے۔ اور یہ تعلیم آپ کو رسول برحق ثابت کرتی ہے۔ یہ میں پہلے بتا چکا ہوں۔ کہ ان کا طریق استدلال سراسر عقل اور دنیا کے دستور کے خلاف ہے۔ ان لوگوں کے ایک گروہ نے ہر ذہنی الجھن کو جنسی خواہشات پر مبنی قرار دیا ہے۔ میرے نزدیک اس معاملے میں انہوں نے یقیناً افراط کی راہ اختیار کی ہے۔ ان کی اس قسم کی تصویریاں خود انہیں پر صحیح طور پر چسپاں ہوتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انسانی فطرت میں عفت پاک دامنی اور شرافت رکھی ہے۔ وہ ہرگز اس درجہ گندی نہیں جس حد تک ان لوگوں نے اسے گندہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ یورپ کے ارباب علم کو معلوم ہونا چاہیئے۔ کہ اسلام خالقِ کون ومکان کی طرف سے آنے والا سچا مذہب ہے، کسی علم کی مجال نہیں کہ اسلام میں کوئی تحقیقی نقص ثابت کر سکے۔ کیونکہ وَاِنَّهٗ لَكِتٰبٌ عَزِيْزٌ ۙ لَّا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ ۭ تَنْزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ (سورۃ حٰمٓ سجدہ۔ رکوع ۵) یعنی یہ غالب آنے والی تعلیم ہے اس پر باطل حملہ نہیں کر سکتا۔ نہ اس کے سامنے سے اور نہ اس کے پیچھے سے۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اتاری گئی ہے جو حکمتوں والا تعریف کیا گیا ہے۔

قاصد ظریف

غزل

نہ کوئی ہم زباں اپنا نہ کوئی رازداں اپنا
رفیقِ گردشِ ایام ہے دردِ نہاں اپنا
یہ غربت ہے یہاں کیا ہوگا کوئی مہرباں اپنا
مشیت ہر قدم پر لے رہی ہے امتحاں اپنا
نشانِ راہِ منزل کیا بتائیں ہمسفر تجھ کو
ابھی منزل سے خود بھٹکا ہوا ہے کارواں اپنا
یہی عالم رہا گر بیقراری کا مجھے ڈر ہے
قرارِ دل نہ بن جائے کہیں دردِ نہاں اپنا
فضائے میکدہ افسردہ ومغموم سی کیوں ہے؟
وہی بادہ وہی ساغر وہی پیرِ مغاں اپنا
میں کیونکر صحنِ گلشن میں نشیمن کی بنا رکھتا
چمن اپنا نہ گل اپنا نہ ہمدم باغباں اپنا
جلائیں گی کہاں تک بجلیاں حیران ہوں قاصد
چمن کا پتا پتا بن چکا ہے آشیاں اپنا

★

ہماری سالانہ کھیلیں

محمد اسلم باجوہ

"مختلف لوگ کھیلوں کے مظاہرے اپنی قوم
کی نیک نامی اور شہرت کے لیئے کرتے ہیں۔ مگر میں کہتا
ہوں کہ آج قوم کو ہی نہیں بلکہ اسلام کو بھی تمہارے مضبوط جسموں
اور اعلیٰ ذہنوں کی ضرورت ہے۔"

یہ ہیں وہ الفاظ جو پرنسپل صاحب نے کالج کی سالانہ کھیلوں کا افتتاح کرتے ہوئے فرمائے۔ میرے کانوں میں نامعلوم کب تک یہ الفاظ گونجتے رہے۔ میں کسی اور ہی دنیا میں پہنچ چکا تھا۔ میں اپنی اس تصوراتی دنیا کی وسعتوں میں اس درجہ گم ہو چکا تھا۔ کہ مجھے یہ بھی معلوم نہ ہوا۔ کہ پرنسپل صاحب کی تقریر کب تک جاری رہی اور کھیلیں کب شروع ہوئیں۔ عابد نے مجھے جھنجھوڑتے ہوئے کہا "کس سوچ میں ہو۔ کیا رات کو اختر شماری کیا کرتے ہو؟ کھیلیں شروع ہو چکی ہیں۔" میں عابد کے کہنے پر کھیلوں کی طرف متوجہ تو ہوا۔ لیکن اسے کیا معلوم کہ میں کس الجھن میں مبتلا تھا۔ میرے دماغ میں پرنسپل صاحب کے الفاظ چکر لگا رہے تھے میں سوچ رہا تھا۔ کیا واقعی اسلام کی ناؤ طوفانوں سے ٹکرا رہی ہے؟ کیا واقعی ہمارے مضبوط جسم اور توانا و درخشندہ دماغ اس کشتی کو اس متلاطم سمندر سے نکال کر ساحلِ امید تک پہنچا سکتے ہیں؟ کیا ہمیں اپنے جسموں کو اسلام کی خاطر مضبوط بنانا ضروری ہے؟ کیا اسلام ہمارے توانا اور خوبصورت جسموں۔ اور روشن دماغوں کا منتظر ہے؟ اور نامعلوم ایسے کئی سوالات میرے دماغ میں چکر لگا گئے۔

پرنسپل صاحب غلط تو نہیں کہتے۔ انہوں نے سچ ہی کہا ہوگا۔ میں مضبوط۔ سڈول اور چست جسموں والے کھلاڑیوں کو دیکھ رہا تھا۔ جو آج مجھے غیر معمولی طور پر دل کش نظر آ رہے تھے۔ مجھے ان کے توانا اور سڈول جسموں میں اسلام کی آن نظر آ رہی تھی۔ مجھے کھیلوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ میں تو یوں ہی شغلاً وہاں پہنچ گیا تھا۔ ان کھلاڑیوں کے توانا اور مضبوط جسموں کو دیکھ کر پہلی مرتبہ میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی۔ کاش! میں بھی ان کی طرح کھلاڑی ہوتا۔ میرا جسم بھی مضبوط اور چست ہوتا۔ میں بھی ان کی طرح کھیلوں میں حصہ لیتا۔ لیکن میرے دل میں ایک اور خواہش بھی تھی۔ جو میری پہلی خواہش سے کہیں بڑھ کر تھی۔ اور وہ یہ کہ میں اپنے جسم کی حفاظت صرف کھیلوں میں حصہ لینے کی خاطر ہی نہ کرتا بلکہ اس لئے کہ اسلام کو ضرورت ہے مضبوط اور توانا جسموں اور درخشندہ و روشن دماغوں کی۔ کاش! میرے جسم کا ہر حصہ میرے لہو کا ہر قطرہ اسلام کے کام آ سکتا۔ میرا بھی اسلام کے جاں نثاروں میں شمار ہوتا۔ آج بھی جب مجھے اپنی سالانہ کھیلیں یاد آتی ہیں تو پرنسپل صاحب کے یہ الفاظ میرے کانوں میں گونجنے لگتے ہیں۔ اور میرے جسم پر نامعلوم کیوں کپکپی سی طاری ہو جاتی ہے۔

"مختلف لوگ اپنی کھیلوں کے مظاہرے اپنی
قوم کی نیک نامی اور شہرت کیلئے کرتے ہیں مگر میں کہتا
ہوں کہ آج قوم کو ہی نہیں بلکہ اسلام کو بھی تمہارے مضبوط جسموں
اور اعلیٰ ذہنوں کی ضرورت ہے۔"

صرف دینِ احمدِ مختار کی باتیں کریں

لوگ کرتے ہیں اگر اغیار کی باتیں کریں
ہم مگر اے دوست حسنِ یار کی باتیں کریں
چار سُو چھائی ہوئی ہیں کفر کی تاریکیاں
آؤ ہم اس مبدءِ الانوار کی باتیں کریں
دہر کو اپنی روش پہ کھینچ لانا ہے اگر
چھوڑ دیں ساحل کو اور منجدھار کی باتیں کریں
دامنِ محبوب پہ آؤ کریں گلکاریاں!
وقت ہے کہ دیدۂ خونبار کی باتیں کریں
ٹوٹنے ہی کو ہے اب تہذیبِ مغرب کا فسوں
آؤ اس گرتی ہوئی دیوار کی باتیں کریں
شیخ صاحب کیا یہی ہے خدمتِ دینِ متین
توڑ کر نوکِ قلم تلوار کی باتیں کریں؟
فیض لازم ہے ہمیں کہ آج سب کچھ چھوڑ کر
صرف دینِ احمدِ مختار کی باتیں کریں!

فیض احمد اسلم

فیض احمد اسلم

بچوں کی نفسیات

تین چار مہینے کی عمر ہی میں بچہ بعض عادات کو اپنانا شروع کر دیتا ہے اور تسلسل و تواتر سے یہ عادات پختہ ہوتی چلی جاتی ہیں۔ بعد میں بُری عادتوں کو دُور کرنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہو جاتا ہے۔ اسلئے ضروری ہے کہ بچہ کی پرورش شروع ہی سے بہت غور و پرداخت سے کی جائے۔ اکثر دیکھا گیا ہے۔ کہ سب سے بڑا بچہ جب بالغ ہو کر دنیا کے حقائق سے دوچار ہوتا ہے تو چونکہ وہ اب تک اپنے چھوٹے بھائیوں پر "حکومت" کرتا رہا ہے اس لئے وہ اب بھی قیادت کے سنہرے سپنوں میں مگن رہتا ہے۔ مگر اس کے برعکس چھوٹا بچہ تمام دنیا سے محبت اور شفقت چاہتے ہوئے خود کو احساس کمتری میں مبتلا اور "محکوم" تصور کرتا ہے۔ اگر شروع ہی سے بچہ کا رجحان اچھے کاموں کی طرف منعطف کر دیا جائے اور تربیت کرتے وقت لا پروائی یا سختی سے کام نہ لیا جائے تو بچہ بڑا ہو کر اچھی عادات و صفات کا حامل ہو سکتا ہے۔ بچہ کو اٹھنے بیٹھنے۔ کھانا کھانے۔ صاف ستھرا رہنے یا اس قسم کا کوئی اور کام کرنے کے آداب سکھاتے وقت یہ ضروری ہے کہ وہ اپنی طبیعت پر کسی قسم کا بوجھ یا دباؤ محسوس نہ کرے کیونکہ یہ بات اس کے ذہنی نشو و نما پر اثر انداز ہوتی ہے۔

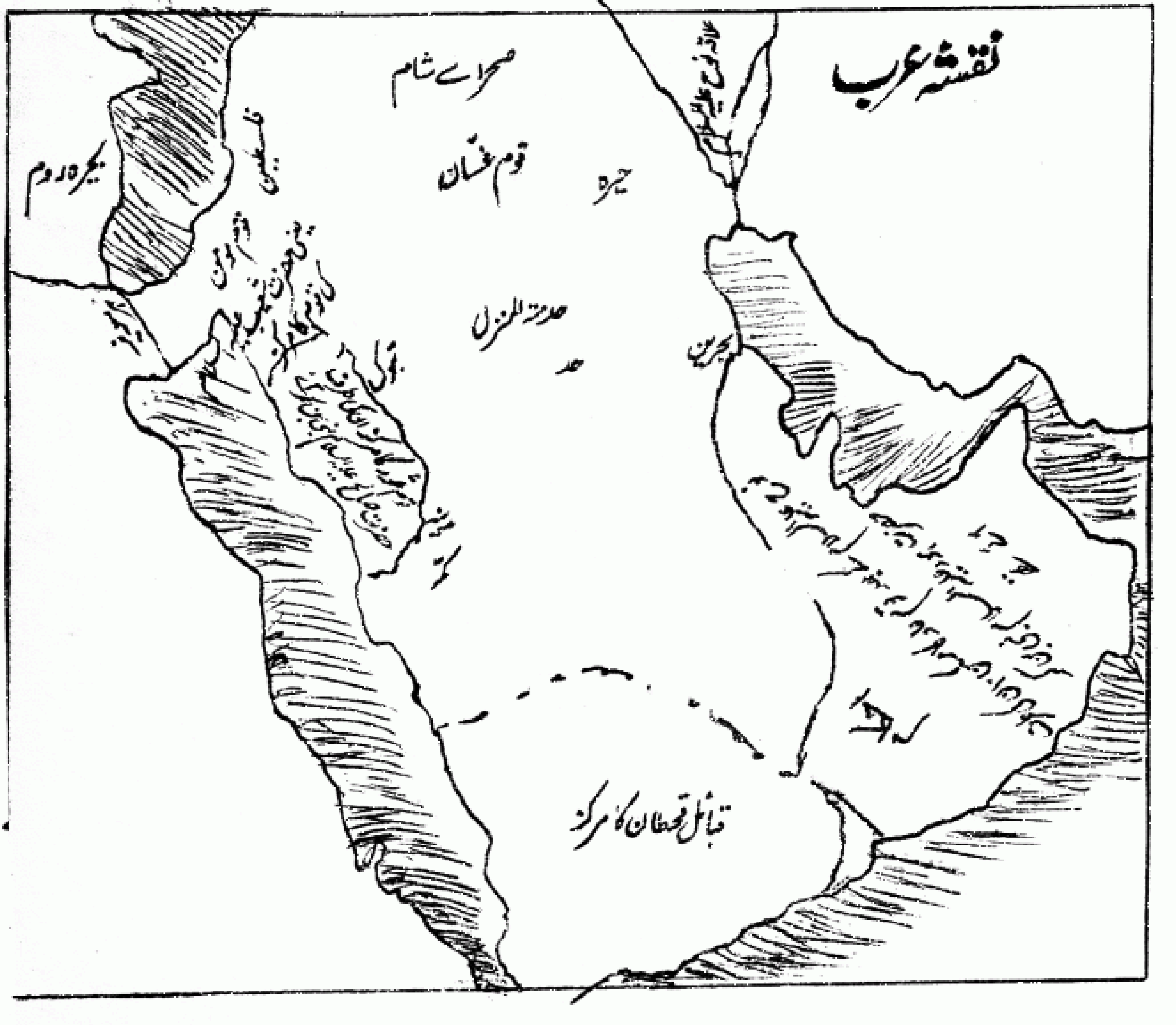
بعض مائیں بچے کو کسی کام سے روکنے کے لئے نرمی اور شفقت کی بجائے گرم مزاجی سے کام لیتی ہیں۔ اور لبا اوقات اس کے دل میں خوف پیدا کرنے کے لئے جن۔ بھوت۔ چڑیل وغیرہ کے قصے سناتی ہیں۔ اگر بچہ تاریکی میں جانا چاہے تو بجائے اس کے کہ اسے ٹھوکر لگنے کے خطرہ سے آگاہ کریں۔ جنوں اور بھوتوں سے ڈرانا شروع کر دیتی ہیں۔ یہ بات نفسیاتی اور مذہبی پہلو سے بے حد خطرناک ہے۔ بچہ کے دل میں ایام طفولیت ہی میں بھوتوں اور کتوں۔ بلیوں وغیرہ کا ڈر بیٹھ جاتا ہے۔ انہیں وہ بڑا ہو کر اپنے نفع و نقصان کے خالق سمجھنے لگ جاتا ہے اور جب اسے خدا تعالیٰ کی اعلیٰ و ارفع ہستی کا احساس دلایا جاتا ہے تو وہ اس پر ایمان لانے میں پس و پیش کرتا ہے۔ کیونکہ وہ اپنی زندگی اور موت کا انحصار بھوتوں اور چڑیلوں پر ہی سمجھتا ہے۔ اسے اپنے سائے پر بھوت کا گمان ہوتا ہے۔ لیٹے لیٹے یونہی دیوار پر اسے ایک ہیبت ناک صورت ابھرتی دکھائی دیتی ہے اور وہ چلا اٹھتا ہے۔ نفسیات میں اس انسانی خیال کے فریب کو HALLUCINATION کہتے ہیں۔ والدین کو چاہیئے۔ کہ جہاں تک ہو سکے بچے کو جنوں بھوتوں وغیرہ سے ڈرانے اور دھمکانے سے پرہیز کریں۔

بعض بچے ایک نئی دنیا کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں۔ اگر انہیں مدرسہ بھیجا جائے تو سکول پہنچنے کی بجائے سارا دن گھومنے پھرنے کے بعد شام کو گھر آجاتے ہیں۔ سکول سے بھاگنے کی کئی وجوہ ہو سکتی ہیں اجنبی فضا سے گریز۔ خرابیٔ صحت۔ مدرس کی سختی وغیرہ جس قدر جلد ہو سکے مناسب علاج تجویز کر کے بچے کی اس آوارگی کو ختم کر دینا چاہیئے۔ بہتر ہوگا۔ اس کے ذہن کو کھیلوں، مصوری اور سکاؤٹنگ کی طرف مائل کر دیا جائے۔ ایسے موقعوں پر تادیبی کارروائی عموماً ضرر رساں ثابت ہوتی ہے بچے کی سب سے اہم جبلت تجسس ہے۔ وہ ہر نئی چیز کو تعجب سے دیکھتا ہے اور اس کی حقیقت کا پتہ لگانے کی ٹوہ میں لگا رہتا ہے۔ اسی لئے بچہ سوال بہت کرتا ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ بچہ ایک مجسم سوالیہ نشان ہے۔ اگر اس کی اس جبلت کی صحیح طور پر تسکین نہ کی جائے۔ اور اسے اُلٹے سیدھے جواب دئے جائیں یا درشتی سے سوالات کرنے سے منع کر دیا جائے۔ تو ظاہر ہے کہ اس کی صحیح، متوازن اور صحت مندانہ ذہنی نشو و نما نہیں ہو سکتی۔ غلط جوابات کی غلطی ظاہر ہونے پر اسے جذباتی دھکا لگتا ہے اور اولاً بڑے عمر کے لوگوں کا اعتبار اور سماجی اقدار کا وقار اسکے دل سے اٹھ جاتا ہے۔ عدم یقین۔ عدم اطمینان۔ شک۔ ڈر اور خوف اسکی طبیعت پر غالب آجاتے ہیں اور وہ ایک متردد شکی مزاج اور ڈرپوک شہری بن جاتا ہے۔ بعض بزرگوں کی یہ عادت ہوتی ہے کہ وہ بچوں کو ہر جائز و ناجائز مناسب اور غیر مناسب مواقع پر ٹوکتے رہتے ہیں اور وقت بے وقت پند و نصائح کرنے میں مشغول رہتے ہیں۔ اور بچے کے ہر کام میں خواہ مخواہ دخل اندازی کرتے رہتے ہیں ایسی باتوں سے بچے میں چڑچڑا پن پیدا ہو جاتا ہے۔ اور اس کی اختراعی قوت کو شدید صدمہ پہنچتا ہے۔

محمد زکریا طاہر

عرب ــــ اسلام سے قبل

عرب کے شمال مشرق میں خلیج فارس سے اوپر ایران و عرب کی مشترکہ حد پر جہاں دریائے فراتؔ و دجلہؔ ملتے ہیں ۔ دونوں دریاؤں کے درمیان حضرت نوح علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کا رہائشی علاقہ تھا طوفانِ نوحؑ کے بعد یہ قوم عرب کے کنارے خلیج فارس و عمانؔ کے ساتھ ساتھ جنوب کی طرف بڑھتی چلی گئی ۔ ایک معزز شخص عادؔ بن ارمؔ بن سامؔ بن نوحؑ کی وجہ سے آئندہ نسل و قوم عادؔ کہلائی ۔ ان کی طرف حضرت ہودؑ علیہ السلام نبی بھیجے گئے تھے ۔ اس قوم کا مرکز عرب کے جنوب مشرق میں احقافؔ مقام تھا ۔ کچھ عرصے کے بعد مغربی صحرائی ریتلی ہوا کی وجہ سے یہ قوم تباہ و برباد ہو گئی ۔ ان کے زمانے میں اور قومیں بھی عرب میں آباد تھیں جن کے نام طسمؔ ، جدیسؔ ، جرہمؔ الاولیٰ وغیرہ تھے ۔ ایک قوم جس کا ذکر عادؔ کے بعد قرآن کریم میں آتا ہے ۔ ثمودؔ تھی جس کا مرکز مغرب کی طرف مدینہ سے کچھ اوپر سمندر کے کنارے پر تھا ۔ اس کی طرف حضرت صالح علیہ السلام مبعوث ہوئے تھے ۔ یہ قوم ایک شدید زلزلے سے تباہ ہو گئی ۔ ان تمام قبائل کو مورخین نے عرب عاربہ قدیمی طور پر نیست و نابود ہو جانے کی وجہ



سے عرب بائدہ بھی کہا ہے۔ قرآن کریم میں بھی اللہ تعالیٰ ان اقوام کی تباہی کا ذکر کرنے کے بعد فرماتا ہے۔ فھل ترىٰ لھم من باقیۃ۔ (حاقہ) کیا ان اقوام کے باقی ماندہ افراد کہیں موجود ہیں؟

حضرت ہودؑ اور ان پر ایمان لانے والوں کی نسل پھر عرب کے جنوب مغربی علاقے میں آباد ہوئی۔ ان کو ایک معزز و مقتدر شخص قحطان کی وجہ سے بنو قحطان نیز بنو قحطان کے پوتے سبا کے نام پر ابادی سبا کہا جاتا ہے، ان کا ذکر قرآن کریم میں بھی ہے۔ اس قوم کو اللہ تعالیٰ نے بڑی ترقی دی اور یہ قوم خوب پھلی پھولی۔ پھر کچھ عرصہ کے بعد انہوں نے سرکشی کی۔ تو خدا تعالیٰ نے ان پر عذاب نازل کیا جس سے یہ تباہ و برباد ہو گئے۔ اس قوم کی تباہی بھی عاد و ثمود کی تباہی کی طرح عبرت ناک تباہی تھی۔ یہ قوم تباہ ہو کر مکہ و مدینہ کے ارد گرد اور پھر عراق عرب میں پھیل گئی تھی۔ انہیں مذکورہ بالا عرب عاربہ (عاد۔ ثمود طسم۔ جدیس۔ جرہم الاولیٰ) سے ممتاز کرنے کے لئے بنو قحطان کہا جاتا ہے۔ تیسری قوم جو عرب میں آباد ہوئی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد تھی۔ جو حجاز میں آکر آباد ہوئی۔ اس خاندان نے بے حد ترقی کی اور تمام ملک عرب پر چھا گیا مکہ کے تقدس اور ایران و شام ایسی متمدن حکومتوں سے تعلقات تجارت کی بنا پر عرب میں اسے تفوق حاصل تھا۔ ان میں سے قریش جن کی مختلف شاخوں کو قصیؓ نے مکہ میں آباد کر کے ایک جمہوری سلطنت کی بنا ڈالی تھی۔ بالخصوص قابل ذکر ہیں۔

عربوں کی وحشت۔ بربریت۔ اوہام پرستی اور طبیعتوں کے اکھڑ پن کی وجہ سے مسلمان مؤرخین اس دور کو "جاھلیۃ" یعنی جہالت کے نام سے پکارتے ہیں۔

جہاں ہمیں ان لوگوں میں ہر قسم کے عیوب اور نقائص نظر آتے ہیں وہاں ہم ان میں بعض خوبیاں بھی دیکھتے ہیں مثلاً ایفائے عہد اور مہمان نوازی وغیرہ

ان کا ذکر انشاء اللہ آئندہ شمارہ میں کیا جائے گا۔

* * *

۱۹۵۱

"وفات یافتن ملک برکت علی صاحب"

والد محترم پروفیسر ملک فیض الرحمان فیضی ایم اے

(۱)

ملک برکت علی از ما جدا شد
جدا شد آہ از ما مرد فاضل
کہ بد رونق بہ گجرات از دم او
بہ جسم محفل او بودہ است چوں دل
وجودش بود فیض و برکت و خیر
کہ رفتے نعمت از وے سوئے سائل
بہ بست و یکے سمبر رو بپوشید
زماں آں ماہ تاباں بدر کامل
زہاتف چوں بپرسیدم تاریخ
بگر داد و رو بما گفتا "مشاغل"
۱۳۷۱ھ

(۲)

ملک برکت علی صاحب
بیکدم فوت مے شود
دل و جان مرا پر غم
فگار و خستہ میکند
زہاتف چوں بپرسیدم
زسال رحلت ملک
بہ آواز حزیں گفتا
"غم و درد و محن دہر" ۱۳۷۱ھ

سید مبشرات احمد

مولانا حالی کی تنقید نگاری

حالی نے اردو ادب کی جو خدمات سر انجام دی ہیں ـــــ وہ ناقابلِ فراموش ہیں۔ اردو ادب کے مختلف شعبے ان کے کارناموں کے زیرِ بار احسان ہیں۔ جہاں وہ ایک مسلّم اور بلند پایہ شاعر ہیں۔ وہاں ایک چوٹی کے نقاد بھی ہیں۔ اور جہاں انہیں علمی مقالات لکھنے میں کمال حاصل ہے۔ وہاں وہ اردو ادب میں فن سوانح نگاری کے بانی بھی ہیں۔ ان کی تنقید شبلی اور آزاد کی تنقید کے مقابلے میں زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ حالی کے تنقیدی شعور کی نشو و نما میں تین شخصیتوں کا دخل ہے

(۱) مرزا غالب

(۲) سر سید احمد خاں

(۳) نواب مصطفٰے خاں شیفتہ

مرزا غالب کی صحبت میں حالی نے ادبی نکتوں کو سمجھا اور ادب کے بیشتر اسرار اور رموز ان پر کھلے۔ سر سید کی دور بینی اور دور رسی نے حالی پر بڑا اثر کیا۔ نیز حالی نے سر سید سے زندگی اور ادب دونوں کو تنقیدی زاویوں سے دیکھنا سیکھا۔ نواب مصطفٰے خاں شیفتہ کی صحبت نے انہیں مبالغہ آمیزی سے نفرت کرنا حقائق و واقعات کے بیان میں لطف پیدا کرنا اور سیدھی سادی سچی باتوں کو محض حسنِ بیان سے دل فریب بنانا عطا کیا۔ غالب اور شیفتہ کی طرح حالی بھی چھچھورے خیالات سے نفرت کرتے تھے۔

گو حالی کی دوسری تصنیفات بھی تنقیدی خیالات سے مزیّن ہیں۔ لیکن مقدمہ شعر و شاعری اس سلسلے کی ایک مستقل کڑی ہے یہ ان کے دیوان کا مقدمہ ہے۔ اس میں انہوں نے شعر و شاعری کی اہمیت کو واضح کیا ہے۔ اس کے معیار کو مختلف پہلوؤں سے جانچا ہے۔ اس کی ماہیت کو بیان کیا ہے۔ نیز یہ کہ اس کا سماج سے کیا تعلق ہے۔ انہوں نے اس میں زبان کے متعلق بھی ایک سیر کن بحث کی ہے۔ پھر آگے چل کر شاعری کی اصناف و اقسام بیان کر کے انہوں نے شاعری کے روشن اور تاریک پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ اور مفکرانہ انداز میں شعر و شاعری کی اصلاح و ترقی کے لئے جادہ حیات کا تعین کیا ہے۔ فی الحقیقت ادب اردو میں یہ پہلی تنقیدی تصنیف ہے جس نے ادب اردو کا ایک شاندار مستقبل ہمارے سامنے اجاگر کر دیا اور یہ بتایا کہ کس راہ پر گامزن ہو کر اردو ادب کی اصلاح و ترقی ہو سکتی ہے۔ انہوں نے ان عیوب پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ جن کو ترک کرنے سے شعر و ادب کی ترقی کے لئے ایک کامیاب اور سازگار فضا پیدا ہو سکتی ہے۔

حالی انجمن پنجاب کے مشاعروں سے بہت متاثر ہوئے ان مشاعروں کا مقصد اردو ادب میں ایک نئی روح پھونکنا تھا اردو ادب میں جو پرانے رجحانات پائے جاتے تھے۔ حالی نے ان کے خلاف سب سے پہلے علمِ بغاوت بلند کیا۔ سر سید کے رسالہ "تہذیب الاخلاق" کے مضامین کی تلخی اور تیزی نے اس تحریک کو اور بھی زور دیا۔ اردو ادب کے پرانے معیار نے جو جامہ پہن رکھا تھا۔ حالی کی مدلّل اور مفصل تنقید نے اسے تار تار کر دیا۔

"یادگارِ غالب" میں جو دراصل مرزا غالب کی سوانح عمری ہے۔ حالی نے مرزا غالب کی شاعری کو مقدمہ شعر و شاعری کے اصولوں کی روشنی میں پرکھا ہے۔ انہوں نے مرزا غالب کے کلام پر تنقید کرنے کے ساتھ ساتھ اس کی شرح بھی کر دی ہے۔ اور ان کے کلام کے نمونے بھی پیش کئے ہیں۔ "یادگارِ غالب" میں حالی نے غالب کے کلام پہ جو تبصرے کئے ہیں۔ ان کی وجہ سے غالب کو سمجھنے میں بہت مدد ملتی ہے۔ "حیاتِ جاوید" جو سر سید کی سوانح حیات ہے۔ میں بھی تنقید کی جھلک موجود ہے۔

"حیاتِ سعدی" میں مقدمہ شعر و شاعری کے سوا سب سے زیادہ تنقیدی پہلو اجاگر ہیں۔ اس میں تنقید کی نئی خصوصیات درج کی گئی ہیں۔ "حیاتِ جاوید" کی طرح یہ بھی دو حصوں پر مشتمل ہے پہلے حصے میں سعدی کے سوانح حیات درج ہیں۔ اور دوسرے میں

سعدی کی شاعری اور نثر نگاری پر سیر کن بحث ہے۔ اس میں حالی نے تنقیدی اصول بیان کئے ہیں۔ اور پھر ان اصولوں کی روشنی میں سعدی کے کلام کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ حالی نے سعدی کے کلام میں ایک خاص مقصد پایا ہے۔ جسے سعدی دنیا کے سامنے رکھنا چاہتے تھے۔ اور وہ مقصد زندگی کی صحیح ترجمانی کرنا ہے۔ ان کے قصائد اور غزلیں زندگی کی آئینہ دار ہیں۔ سعدی نے دنیا کے سامنے سوسائٹی کے گھناؤنے مناظر پیش کر دئے ہیں۔ نیز انہوں نے زندگی کے مختلف مسائل کو شاعری کے دامن میں جگہ دی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حالی سعدی کو ایک بڑا اور بلند پایہ شاعر قرار دیتے ہیں جنہیں صرف شاعری ہی ملحوظِ خاطر نہیں۔ بلکہ وہ سوسائٹی کے کمزور پہلوؤں کو آشکار کر کے ان کی اصلاح بھی کرنا چاہتے ہیں۔ مقالاتِ حالی بھی حالی کے تنقیدی شعور پر روشنی ڈالتے ہیں۔ ایک مبصر کی حیثیت سے حالی یہ دیکھتے ہیں۔ کہ کتاب کے مصنف نے زمانے کے مذاق کے مطابق اس کتاب میں کیا فرائض سرانجام دیئے ہیں۔ وہ دیکھتے ہیں۔ کہ کتاب کا عنوان کیا ہے۔ اس کے مضامین کی ترتیب کیسی ہے مصنف زمانے کے مذاق کے مطابق دلائل دیتا ہے یا نہیں۔ نیز اس کی رائے مختلف مسائل کے بیان میں کیسی ہے اور اس کے کتاب لکھنے سے مقصد کیا ہے ؛ وغیرہ

المنار کا مسلک

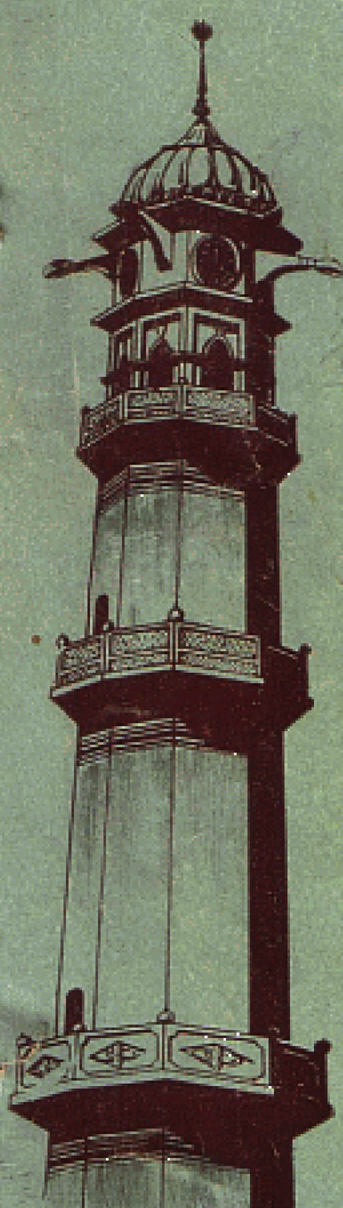
م۔ع۔خ

ملک کے اطراف و جوانب سے سیاسی، ادبی، علمی اور تفریحی ہر نوع کے رسائل شائع ہوتے ہیں۔ ان میں سے بعض کا مطمحِ نظر مخصوص سیاسی نظریوں کی اشاعت و ترویج ہے۔ بعض کا مقصد علم و ادب کی خدمت اور بعض محض تفریحِ طبع کی غرض سے شائع ہوتے ہیں۔ تعلیمی اداروں سے جو ماہنامے منسوب ہیں۔ ان میں سے بھی بعض علمی و ادبی اور بعض محض تفریحی ہیں۔ "المنار" کو ان میں سے کون سا مسلک اختیار کرنا چاہیئے۔ ادارۂ "المنار" کے لئے یہ ایک اہم سوال تھا۔ اور کسی نتیجہ پر پہنچنے کے لئے اسے ہر پہلو پر غور کرنا تھا۔ طبیعات اور کیمیا، ریاضی اور اقتصادیات، فلسفہ اور تاریخ وغیرہ مضامین پر گھنٹوں دماغ سوزی کے بعد تھکے ماندہ جسموں اور پژمردہ ذہنوں کے لئے چند لمحوں کی تفریح "المنار" اپنا منتہا قرار دے۔ یا اس سے بلند تر مقصد ــــ سنجیدہ نظری اور سنجیدہ نگاری جو قارئین "المنار" کی ذہنی صلاحیتوں کو جلا دے اور انہیں بروئے کار لائے۔ مقدم الذکر مقصد میں ہمیں کوئی جاذبیت نظر نہ آئی۔ اس لئے کہ اس کی افادیت آنی و لمحی ہے۔ اس لئے ہم نے مؤخر الذکر مسلک اختیار کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ ایک تعلیمی ادارے سے منسوب ہونے والا ماہنامہ ہمارے نزدیک معیاری ہونا چاہیئے۔ جو سنجیدہ نگاری کا مرقع اور علمی تحقیق و تجسس کا حامل ہو۔ اس لحاظ سے اسے تجارتی رسائل سے ممیز ہونا چاہیئے۔ پھر اس ماہنامہ کے لئے جو تعلیم الاسلام کالج سے منسوب ہو۔ اس کے علاوہ بعض اور امتیازات کا حامل ہونا بھی ضروری ہے۔

تعلیم الاسلام کالج ایک اہم مقصد کے لئے معرضِ وجود میں آیا ہے ــــ جدید علوم کی ترویج و تعلیم ــــ اسلامی نظریات کے پس منظر میں ــــ مقصد عالی اور منزل کٹھن ہے۔ جو سعیٔ پیہم اور جہد مسلسل کی مقتضی ہے۔ اس لئے ضروری ہے۔ کہ تعلیم الاسلام کالج کا ماہنامہ اسی مقصد کو پیشِ نظر رکھے اور معیاری ہونے کے علاوہ جدید علوم اور اسلامی نظریات کا آئینہ دار ہو۔

پبلشر جنید ہاشمی نے انشاء پریس لاہور سے چھپوا کر شائع کیا

Almanar



Talim-ul-Islam College

Magazine

★

FEBRUARY - 1952

قل اللهم مالک الملک تؤتی الملک من تشاء و تنزع الملک
ممن تشاء و تعز من تشاء و تذل من تشاء ط بیدک الخیر ط انک
علے کل شئی قدیر ۔

Say, O Allah, Lord of sovereignty, Thou givest sovereignty to whomsoever Thou pleasest ; and Thou takest away sovereignty from whomsoever Thou pleasest. Thou exaltest whomsoever Thou pleasest and Thou abasest whomsoever Thou pleasest. In Thy hand is all good. Thou surely hast power to do all things.

(Al-Quran, Part 3, Chaptet 3, Verse 27)

ALMANAR

TALIM - UL - ISLAM COLLEGE
MAGAZINE

February - 1952

Editor - in - Chief

Prof. Akh. M. Abdul Qadir, M.A.

Editors

Naeem Ahmad
Mirza Khurshid Ahmad

Asstt. Editor

Syed Nasir Ahmad

Contents

Vol. Two No. 4

Printed at Insha Press, Urdu Bazar, Lahore and Published by A. R. Junaid
for the T. I. College, Lahore.

Editorial

THE advent of the new year witnesses a change in the editorial staff, a change for better or for worse none can predict. But if we are expected to be factual in what we have to say, then we must needs admit that the old year has departed, and with it, also, are gone youthful geniality, journalistic experience and technique, and psychic insight, of which singular virtues is compounded our predecessor to whom goes, of course, all the credit of a pioneer's achievements, to be replaced only by grey-haired ignorance, conservative disposition and plain speech, perhaps, reminiscent of the mid-Victorian period, though, without doubt, the substitute was born in the beginning of the present ultra-modern twentieth century. We have vague misgivings, lest he should turn out to be a square peg in a round hole. However, the new man will strain every nerve to adjust himself to the new mode of self-expression. It is very much of a promise and should not stand indentified with performance. Of pious intentions and earnest efforts we will not be sparing, but that we shall be able to reduce the distance between promise and performance to the irreducible point, we cannot yet affirm with confidence, for

> "Our thoughts are ours, their ends not our own".

But all the same, none of our readers should form the impression that we are preaching pessimism, or at least sounding a disheartening note at the outset. We have been in the habit of seeing facts eye to eye and calling a spade a spade. Thus those factors cannot be ignored which bar the way of the best performer to universal applause, not to say of an editor, particularly of the type already hinted at, whose case stands undoubtedly bracketted with the celebrated anecdote of the old man, his young son and their quadruped, with which many a tyro of ten at school has regaled himself. Like them, he cannot, for the life of him, please everybody, though he may "scorn delights and live laborious days", with an eye to win their approbation.

An editor, to our thinking, is one among the commonplace commodities; inasmuch as he is a member of the species that are widely scattered in every part of the world, but by reason of his office, he should be and, in fact, is expected to be a prodigy. He is charged with catering to every taste and temperament by wielding his facile pen. His comic muse should minister to those who live by smiles, while his tragic muse should melt those who live by tears. But the major bulk consists of those who are interested in a mixture of both, like the present-day adulterated food on which

the masses are being trained to subsist under the pretext of its possessing highly vitaminised merits. His endeavours should further be marked with a philosophic undercurrent to gratify the intellectuals, also ,even though such speculative vein, more often than not, becomes paradoxical.

An editor, as conceived both by the sophisticated and the unsophisticated, is a being of versatile parts and tremendous potentialities, whose range is as wide as the world that we inhabit—if the term be not a hyperbole—. There is nothing that comes not under his scrutiny, nothing that escapes his notice. He animadverts freely on the stage, the screen, and the platform ; he criticises intrepidly the conduct of individuals and communities in every walk of life ; analyses current problems and events and points to their future trend ; discusses political and social situations both abroad and at home ; expresses his views on arts and sciences ; voices the popular sentiments ; registers the sobs and moans of the orphans and widows ; reports the pangs of hunger and poverty and the weary wanderings and unavailing quest of the unemployed ; poses as a censor on public morals ; reviles vice in every form ; rails at folly and cowardice; tirades agaist red-tapism, law's delay and corruption ; gibbets tyranny, exploitation and injustice ; examines and exposes the clandestine tactics and latest methods of the profiteers, hoarders and black-marketeers, with a ruthless hand. He peeps into the gambling dens; intrudes into the haunts of vice and the squalid slums ; visits the gay clubs set amid a forest of gorgeous limousines and noted for their cocktail libations, fiscal adventures in Bridge, and the persuit of higher culture ; and sees the flamboyant fashions of amateures and the exquisite sartorial styles of punters at the race-course. He catches a glimpse of the "gleaming world of the gods" that forge fresh thunderbolts and hurl them from their heights on the toiling and bleeding millions below, we mean the war-lords whose bellicose mental make-up has invented the war-jingo of a peculiar character, which talks of 'peace' but means preparation for 'war', whose vested interests, in the guise of daily expanding armaments, must survive, though mankind may not, whose ideologies, ignoring the sanctity of human life, rate man but as fodder for the cannon-monster, and who seek to usher in the long dreamed of Millennium by another orgy of blood, though whole populations may vanish for ever—though God's green earth may become a blackened and blasted heath, this blooming buzzing world, a howling wilderness. He essays to x-ray the 'iron curtain' to see what preparations are afoot behind it, he eavesdrops at the Whitehall, and No. 10 Downing Street to listen to the deliberations in the closet regarding the plans for the liquidation of bewildered humanity. After this panoramic survey, like the magic mirror of the Lady of Shalott, he, through the medium of his journal and according to his lights, contributes his mite to constructive programmes and schemes for human welfare and progress. In short, he leaves no department untouched, no avenue unexplored. His jurisdiction extends from pole to pole. All creatures,

from the tiny worm wriggling and writhing in the dung on the ground to the golden eagle poised on outstretched wings amid the white fleecy clouds in the sky, figure in his reviews. All topics between the earth and the empyrean sit plumed on his pen. Nothing jars, nothing comes amiss to him. He combines in himself, a frail personality, the statesman, the artist, the diplomat, the critic, the parliamentarian, the connoisseur, the soldier, the reformer, the preacher, the leader, the rebel, and what not. He is something of everything, he is nothing of anything.

To the common man, an editor is his friend, philosopher and guide, a source of inspiration. He is gruel and jelly to the sick, egg-flip to the convalescent, a tonic to the strong and sturdy, a light to the dark mind, a ray to the blind eye, a solace to the distressed heart, a balm to the bruised spirit, a champion of the underdog in the fight. But after all he is the stuff of which human beings are made and, therefore, is subject to all those ills this flesh is heir to. He at times grows oblivious of the sacred trust. Pressed hard by his privations, he falls an easy prey to subsidy. The lure of gold becomes irresistible. His becomes the voice of partisanship. He quits the lofty summit of dispassionate vision which commanded wider prospects extending almost to the horizon. The scientific attitude of mind gets contaminated with sordid bias and prejudice. The liberal outlook shrinks into a narrow insipid view. He loses the balance of internal highmindededness and comes down the high pedestal with an ill grace. His heart is full of chagrin and rancour. He turns a scurrilous scribe. He concocts libels, propagates falsehood, spreads scandals, rages fiercely in turbid controversies, and betrays the noble cause of truth and justice.

An editor is not altogether deprived of the moments of relaxation after he has crowded into the printed page the cogitations of his mind. He, like others, must enjoy his off days and persue his hobbies. He plans an outing, a by-trip to an outlying place with a fowling-piece. He may sometimes proceed on a long shoot with his party and return with an enormous bag. In case weather conditions do not permit of such a diversion abroad, he holidays and practices shooting at home, or he may have a turn at Chess and exibit his skill in Table-Tennis. He goes a-hiking at times to strengthen his fibre and imbibe the rugged grandeur of rock and hill.

He is among the first, perhaps, to be present at poets' courts, declamation contests, academic debates, concerts, athletic sports, regattas, etc., and is further allowed the privilege of moving in elegant social circles to be worldly wise and of hob-a-nobbing with grandees at magnificent banquets and sumptous tea parties, so that the hosts should live in his columns, also, as they live on earth. The way to printed fame is paved with delicious dishes and flavoury viands as the way to h—is paved with good intentions, a truth proved a million times over.

In the matter of style and diction, his position is not at all enviable. His mind is on the stilts, because, after all, style is a thing of individual taste and

choice, in the composition of which predilections and aptitudes largely enter. One cannot but express oneself in one's own peculiar way. An editor's case is not dissimilar. Thus he is ever on the horns of a dilemma how to comport and conduct himself in his scribblings so as to meet the requirements of varied tastes and likes. Via-media is out of the question here; even if it were, it would be hard to define. If he is somewhat learned and scholarly, he is dubbed pedantic ; if he is naive and familiar in speech, he is slangy; if he is a little too ardent in his appreciation of a work, he is a snob ; if he is silghtly profound and thought-provoking, he is a peg too high ; if he is elaborate, he is not suggestive, if compact, he is not comprehensive, and *vice versa* ; if he embellishes his discourses with usual figures of speech, he is poetic ; if he has a recourse to unadorned simplicity, he is boorish and vulgar. And again there is a class of readers that looks up to him for the polished terseness and gentle irony of an Addison, the satiric perspicuity of a Swift, the rhetorical splendour of a Burke, the picturesque rhythms of a Ruskin, the stately roll of a Gibbon, the ecclisiastic grace and purity of a Newman, or the majestic periods of a Macaulay. It is evident that he cannot achieve all these effects simultaneously, though turn by turn he may feebly attempt to take a leaf out of the book of these great, nay peerless masters, provided his native gifts can carry him to the coveted and yet hardly ever-attained level. But these considerations apart, his serenity, lucidity, and sincerity, on the whole, may remain undisputed.

Malik Masud Ahmad
Student M.A. (Arabic)

Hazrat Umar a Unique Caliph of Islam

HAZRAT Umar occupies a unique position in the annals of Islam on account of the conquests of his time and his administrative achievements.

When he took charge of his office as the second caliph of Islam, the Muslim armies were waging war against the two mighty empires of the world—Persia on the one hand and Byzantine on the other. It was, therefore, his first task to carry on these conquests victoriously. When we turn to the pages of Islamic history we find that, under his expert guidance, the battles on both the fronts were conducted in the best manner cenceivable by Commanders like Khalid Ibn Walid, Abu Ubaidah, Sa'd Ibn Abi Waqqas and Amr Ibn al As. Although the Caliph himself did not participate in any of the battles of Iraq, Syria and Egypt, yet it is to be noted that the Commanders of the Muslim armies virtually acted in accordance with his instructions, which they received from time to time. So, in a way, he himself was the Commander-in-chief of the Muslim armies. There is little space here to admit of a detailed account of the conquests made under him, but it is indisputable that the subjugation of the great empires of his time, to which we have referred above, mainly depended on his powerful strategic policy. The boundaries of the Muslim Empire were extended and the followers of Islam came into contact with the people of the then civilised world. It is, however, to be remembered that when the Muslims swept across Syria and Persia, they did not inflict any cruelty on the population of the countries, as they had been strictly directed by the Caliph to desist from such a course.

The administrative measures initiated by Umar the Great, rank him among the greatest rulers and reformers of the world. Among his achievements is the introduction of the pure democratic system of Government based on Islamic law, justice and equality. He used to seek the counsel of his wise Companions in all matters relating to administration and war. He used to say, "There is no Caliphate without consultation of the people."

Hazrat Umar had a keen insight in making the selection of the Governors for the various provinces, into which he had divided all the Muslim Empire. On his appointment, the Governor of a province (Amil) was given a letter prescribing the limits of his authority. It was ordered to be read out to the public, so that it might know the extent of powers vested in their newly appointed ruler. Moreover, all the Governors of the various provinces were required to be

present at the time of annual gathering (Hajj), in Medina, and in their presence it was publicly announced that whosoever had got a complaint against any of them, should come forward with it. It has been substantiated by historical evidence, that on certain occasions, Umar had had recourse to the punishment of the officers, in public, who failed to discharge their functions with a sense of responsibility. According to the author of "Futuh-ul-Buldan," a list was prepared of the articles, which the *Amils* took with them to the Province in which they were appointed. The list was preserved for the purpose of tallying it with the paraphernalia, which they brought back with them on the expiry of the term of their office. Any addition, if found, was to be confiscated by the State.

The establishment of the State Treasury (Baitul Mal) at the Head quarters and its branches spread over in the various provinces, and the appointment of honest and efficient officers for their supervision, were a great task which was accomplished by the Second Caliph of Islam. Although Abu Bakr had laid the foundation of this system, yet before he could achieve any measure of success in it, he died.

As a vigilant Caliph, Hazrat Umar himself took pains in instituting a strict supervision of the State income and expenditure. It is noteworthy that the income of the State Treasury or Baitul Mal, as we generally call it, used to be spent on the welfare of the masses. Further it is a well-known fact that every suckling mother used to receive stipendiary aid from the Government. Treasury for her infant. At the outbreak of an acute famine in his time, Hazrat Umar became extremely anxious about his subjects. All that was in the treasury was spent in helping the starved humanity. In obedience to his order, 1000 camels, loaded with grains, were sent by the Governor of Syria and 20 ships were sent by that of Ggypt. A list of the famine-stricken people having been prepared, the grains were thus freely distributed among them.

There was no regular army in the time of the first Caliph and the Holy Prophet as well. Whenever need for war arose, people used to offer their services voluntarily for *Jihad* The credit of establishing a regular military department on a sound footing, goes to our hero, who divided it into several grades. The higher officers were in receipt of higher salaries, while the soldiers received lesser amount of stipends. The Military men were also given stipends for their children. As we are informed by the great historian, Tabari, there were cantonements for the forces and a number of 4000 horses used to be kept in each, always ready with the necessary arms, for any emergency that might arise. A staff of correspondents or diary-writers used to accompany the troops, who kept the Caliph informed about the progress of events on the battle-field and thus he was enabled to guide the armies wherever they might be.

Judicial Department, after having been separated from the Executive, was established and for it the selection of

judges was made with a full consideration of their merits in points of capability, piety, brilliance and power of judgment. The courts were set up in all the districts. The caliph made it a point that no person could be appointed as a Judge (Qadi), unless he was rich and commanded great respect among the people. This was meant to avoid the possibility of the judge being tempted by the litigant public. It is significant to note that, like Hazrat Umar, some of the modern civilized countries of the world have not even been able to separate the Judiciary from the Executive.

The existence of the Police Department for law and order is an essential thing. It was in the time of the second Caliph of Islam that such a department was also set up for the maintenance of peace in the country. Again, prior to his caliphate, we do not find any jails for imprisonment of the offenders. So, these were, too, founded by him.

In the field of imparting education relating to Quran and tradition, he made special arrangements for this purpose. He also did great service in acquainting the people with the day to-day *Masail*—*i.e.*, problems, which came under the head of jurisprudence.

Apart from being a man of great noble qualities, he was very kind-hearted and sympathetic as well. It is reported of him that he patrolled the streets at night and enquired about the grievances of the poor. The incident of an old woman who, for want of anything to cook, had put pieces of stone in a kettle on the hearth, just to silence the weeping children, is too widely known to be repeated here.

He led a simple life and we do not find any trace of pomp and show in his movements. He did not wear gorgeous robes, but on account of his patched up garments he could hardly be distinguished when sitting in the assembly of his companions.

After the fall of Jerusalem, the Christians demanded that the Caliph should himself come to them and write the pact of peace. It is recorded in history that when he approached the sacred city, the Muslims offered him a Turkish horse and a precious robe befitting his lofty station with the idea lest the Christians should have occasion to ridicule the shabby appearance of the Caliph. But it is astonishing to note that he refused to appreciate their idea and remarked, "Islam is the real honour and respect granted to us by God and it is quite sufficient for us."

The sympathy and regard, which he showed for the rights and privileges of the non-Muslim subjects, is obvious from the contents of the pact effected by him, which guaranteed full liberty to the conquered people in respect of their religion and it also undertook the security of their life and property in lieu of payment of a nominal tax called Jizya.

In short Hazrat Umar combined in himself the qualities of a unique administrator, a kind and sympathetic ruler, a master of jurisprudence, and a genius conversant with the art of eloquence and rhetoric who in the capacity of an illustrious Caliph rendered great service to Islam and set a noble example for the generations to come.

Prof. Sufi Abdul Aziz, M.A.

In Praise of God

(Just a word of thanks is due to Professor Sufi Abdul Aziz, M.A., for an English version of a throbbing hymn addressed to God by the Founder of the Ahmadiyya Community. Though a rhymed version would have been a fit match for it, yet the spiritual ardours can be caught in this simple translation—*Ed.*)

(۱) قربان تست جان من اے یار محسنم
بامن کدام فرق تو کردی که من کنم

1. O my Beneficent Lord ! My life is but an humble offering to Thee. What hast Thou left unaccomplished for me that I should leave undone for Thee ?

(۲) هیچ آگہی نبود زعشق و وفا مرا
خود ریختی متاع محبت به دامنم ۔

2. I was quite ignorant of love and loyalty. It is Thou Who hast graced my lap with the wealth of Thine love.

(۳) ایں خاک تیره را تو خود اکسیر کردهٔ
بود آں جمال تو که نموداست احسنم

3 It is Thou Who hast made an elixir of this dark clay. It was Thy beauty that made me so graceful.

(۴) ایں صیقل دلم نه بزهد وتعبداست
خود کردهٔ بلطف و عنایات روشنم

4. The lustre of my heart is not due to my piety and devotion. It is Thou Who hast illumined me with Thy favour and kindness.

(۵) صد منت تو هست بریں مشت خاک من
جانم رهین لطف عمیم تو در تنم

5. Thou hast showered hundreds of Thine favours on this mortal frame. My life owes a debt of gratitude to Thy universal kindness, and so does my body.

(۶) سهل است ترک هر دوجهاں گر رضاےتو
آید بدست اے پنه وکهف و مامنم

6. It would be easier for me to renounce both the worlds if I happen to win Thy Pleasure, O the Source of my refuge, shelter, and peacel !

(۷) فصل بهار و موسم گل نایدم به کار
کاندر خیال روےتو هر دم به گلشنم

7. What use are the seasons of spring and flowers to me ? I am ever in the garden visualising Thy face.

(۸) چوں حاجتے بود به ادیب دگر مرا
من تربیت پزیر ز رب مهیمنم

8. What care I for any other instructor ? I have received instruction direct from the Lord Protector.

زان سان عنایت ازلی شد قریب من (۹)
کامد اے یار زهر کوے و بر زنم

9. The eternal benevolence has drawn so nigh to me that the voice of the Lord is reaching me from every nook and corner.

یا رب مرا به هر قدمم استواردار (۱۰)
وان روز خود مباد که عهد تو بشکنم

10. O God keep me steadfast at every step. May that day never dawn when I should break my promise to Thee.

در کوے تو اگر سر عشاق‌را زنند (۱۱)
اول کسے که لاف تعشق زند منم

11. Even if in Thy lane they chop off the heads of Thy lovers, I will be the first man there to talk tall of Thy love.

★

The Horizon

I stood on the top of a rock and saw
The silent blue sky over my head.
I looked to the north, west, south, but none
I found, in the east the sun but dead.

But the redness of the sun was glittering still,
And there was the meeting point of earth and sky,
Long far away and across the horizon,
A blue deep sea was spreading by and by.

The birds were flying towards that sea,
The darkness was spreading slowly around me,
But only for a moment, and then there was none.
Ah ! alas ! the pretty horizon dived into the sea.

Sami Ullah Qureshi, I Year

M. A. Q. for Mr. J-

AH! THAT INSPIRATION

THE other day I reiterated my request on behalf of the Editor to Mr. J...... in good humour to give me his article in accordance with his promise. Instead of having the ecstatic delight of the real feel of the much prized manuscript which I had anticipated, I had a rejoinder of a lukewarm type which, though it meant a mild disappointment as is very frequently the case in such transactions, I had to take in good part. My friend while chewing the betle and benevolently ogling through the optical lens burst into sudden laughter that revealed through the coral lips the red-coated set of even teeth, and said in a sauve apologetic tone: "To be sure, I had a great mind, though. (a slight pause) There has been no inspiration at all." Whereupon there was another roar and we parted.

"There has been no inspiration at all", I lisped to myself over and over again. It set me thinking. Times out of number such words have served as a ready-made excuse to put off the importunities of a journalist who has to scramble a good deal to collect his material from whatever source he can. He particularly seeks help, as is natural, in those quarters where, owing to his friendly association, he is sure to advance his cause and meet with success in his overtures. But, as they say, "Oft expectation fails wherein most it expects." This experience, like history, had to repeat itself. But no matter, I shall try and write the article for him as is the custom which prevails universally everywhere, though my friend's promise was hardly suggestive of the implication of the nature already pointed out, namely "No inspiration, no mood came on, no motive force to set the organs of the intellect in motion." Oh! Would, this argument founded on the bed-rock of mood which like the wind bloweth where it listeth were listened to by those in the leading strings. The teeming millions of this unhappy globe are in 'no mood' for another war, when the frightful nightmare of the last one is not yet over, but the frantic race for armaments, mutual suspicions and distrust, Atlantic Pacts, Mediterranean & South-East Asia Security etc. are signs awful enough to make one feel and believe that mankind are once again being caused to drift into another blood-bath The plea of lack of inspiration on the part of the peoples lacks inspiration for those at the helm of affairs, who already seem to be in a 'mood' for another trial of arms. But this was by the way. Reverting to the point, I would say that if this my attempt inspires Mr. J......to brace himself up to

play his part for the future issues of the magazine, then it will not have been in vain. This feeling of self-complacent content will be a blessing for me.

Inspiration, be it khown, can be conveniently classed into two main types, Common and Uncommon. Though both types have points of sure contact, and certain aspects common to themselves, which render nice discrimination between the two well nigh difficult, yet the ditinguishing elements are connoted by the above terms so well as to establish their separate entity. The difference between the two is of quality, intensity of degree, and varied frequency. Love for the aunt and beloved though apparently the same, will certainly be different in each case and clearly marked with quality and degree.

Thus inspiration of the Common type is not the prerogative of lofty talent and genius. It is the privilege of mediocrity, provided we presume that the common sort, too, have not altogether to be deprived of this experience whose mystic pains and pleasures are known on a much higher level to extra-ordinary intellects alone. This is, perhaps, to create a bond of affinity, though ever so feeble, between these dwarfs and those giants, and enable them to appreciate better the latter race who "by their deeds, massive and great" have distinguished themseleves and whose name is writ large on the ample page of time. This category of inspiration does not imply waiting till the ethereal tides flow into the great soul and pour themselves forth again into either words or deeds that matter, nay endure for ever like an inscription on granite. You have often to take the initiative and tempt it to come by putting yourself to the job at once. When you have proceeded a little in the work so started, then you feel as if things were making themselves straight and smooth, and shapes emerging clear from the surrounding mist. Your progress continues till the task is accomplished to your general satisfaction. In other words, a slight bending of the will and a somewhat resolute handling of the work lead on to that toiling mood which again contributes to the sum-total. In psychological terms it all means an adjustment to its conditions. Thus much depends upon your attitude and method of approach. If on the other hand you go on dilly-dallying, and sitting cross-legged and patting the red tip of your nose, this shy bird may take alarm and fly away. Therefore, the best method to catch inspiration, whose illusory nature increases in proportion to our langour and indolence, is an instant application of your energies to the task you have set yourself. The rate of your progress will determine proportionately the rate of inspiration that is your portion.

As regards the inspiration of the Uncommon type, the epithet itself is so very expressive. It is astoundingly marvellous in point of both quality and degree, and has invariably always grown and flourished amid trials and tribulations, sufferings and sorrows, vicissitudes and hardships, and under grievous handicaps and disabilities. One feels as if the storms without raised the storms within. There may be here and there a few

exceptions, but they serve more to prove the rule than otherwise. Shakespeare, while a country wag, was, in consequence of an act of poaching, driven to London where his career, chiefly at the Globe theatre, from the humblest workman to the manager and playwright established his pre-eminence in the superb art of drama all over the globe. Neither marble nor brass can outlast his imperishable rhyme. Milton was blessed with vision when he lost his vision ; he saw when he saw not. Of extremely pathetic circumstances, a blind middle-age, surrounded with a world dark and full of dangers, a wretched life of domestic unhappiness and fierce turgid political controversies, was born The *Paradise Lost*, that immortal epic, followed by *Paradise Regained* and *Samson Agonistes*. Dante's *Divine Comedy* was shaped while in banishment. Shelley was most melodious in the effusions of his unpremeditated art when he fell and bled on the thorns of life. Byronic force and melancholy revealed themselves at their best when in exile. *The Vicar of Wakefield*, that compendium of human wisdom formed in the sweetest and most loving language was the outcome of broodings in an insolvent's prison. Sir Walter Scott's best romances emerged from his heroic struggle to save the publishing firm from ruin. More often than not, then it is a broken heart that offers the world those burning *Sonnets* addressed to the Dark Lady, an *Antony & Cleopetra*, an *Illiad*, a *Madonna*, a *Taj*.

In the realm of deeds, also, we come across inspiration that led to splendid heroism, perseverance and strategy. Robert de Bruce of Scotland's soul-stirring address to his soldiers, after his study of the crawling insect, and masterly plan and gallant fight on the field of Bannockburn furnish a fine example. Precisely parallel to it is that of Baber who founded the Mughal Empire in India at the plain of Panipat. Napoleanic Wars, the Crusades, World-wars I & II, all afford outstanding instances of military genius rising supreme amid the storm and stress. Difficulties hemming the hero thick on all sides call forth his mettle which proves itself in a hudred and one ways. In shockingly grim and almost impossible situations that inspiration to act decisively and valiantly would perform prodigies.

There may be a third kind of inspiration partaking of both the Common and the Uncommon which it may not be difficult to comprehend as it forms a part of our daily experiences. It is common because it is in common practice all the world over. It is uncommon because it emanates from a humble source in reality, but manifests itself as bearing the hall-mark of aristocratic standards. This Common-cum-Uncommon type is a plant which grows in every soil, in every climate, and breaks down all barriers of longitude and latitude. In what is known as officialdom, it is an open secret that the lower cadres supply inspiration to the higher cadres, which again hand over their legacy to those of higher degree. The poor clerk inspires the officer, the officer the head of the department. The under-secretary perfoms this function for the secretary, who in turn does the same

for the minister and the ruler, who fitly arrogate to themselves the credit of the achievement. Their public utterances, speeches, addresses, statements, toasts, etc., all which pass for original masterpieces in elocution and thought, are the outcome of the sweating pains of those obscure lives whose destiny is that of the little streams and tributaries that feed, swell, and expand the rivers which again pour their waters into the seas. In fact most of these jewels seldom shine by their own light. Thus this kind of inspiration is secondary. The writer just demurred to fit it into the scheme of the two types. The primary object is to achieve greatness with the help of whatever resources and initiative and push may be at one's command. Inspiration will automatically come in its wake, rather a multitude of inspirations, so that selective process in regard to those which suit well your purposes and expediencies will become a stiff problem. But this stiffness is sure to evaporate and solution is rendered easy if backstairs' influence, strong commendation, and social pressure are resorted to.

Inspiration varies in character according as life passes from stage to stage. A child's inspirations centre round sweets and flowers, glittering toys and knick knacks, sporting acitvity that, in endless imitation, enacts all parts, festivals, funerals, courts and camps, and round the last refuge of a mother's fond kisses. With a boy it is ramblings in the countryside and woods, bird-nesting, capturing butterflies, seeing cock and dog fights, and playing the truant to the teacher. A young man's inspirations lie in love, travel, adventure, romance, friendship, pictures, picnics, etc., while with a fully grown up man inspiration assumes the form of strife and a full consciousness of the stern realities of existence and an equally poignant sense of responsibilities. In old age, it is of a piece with its mellow and feeble character ; inspiration melts into devotional meditations, pieties, sighs and regrets at the lost opportunities, thwarted quests, frustations and ennui, together with an eye to divine grace when the closing scene draws near.

Just as rich soil and manure are essential to the growth of plants, so certain outward helps are necessary for the development of inspiration in different individuals. The most common of these on which it thrives are wine, cocaine, tobacco, coffee, tea, opium, 'hasish'. The last two, on the whole, have found favour with the East, while the first two enjoy soveriegnty in the West. And as for the ramaining three, they have become the common heritage of all climes, though, sooth to say, there is no part of the world where the people can claim ignorance of the blessed benefits of all. Writers, speakers, statesmen, leaders, etc., generally receive their inspiration from wine, tobacco, cofee and tea. Churchill's pugnacious eloquence lies in the cigar, Chesterton's laughing philosophy in the fuming cups of tea. Dr. Johnson attained heights when he "drank tea in oceans, and tore meat like a tiger". Coleridge wove his dream fantasies under the influence of laudanum. Actors, they say, are at their best when they have had their

glowing draught. The histrionic talents of filmstars brighten as they consume large doses of toffee and chocholate. In our country the common man is inspired by a combination of the betle and 'bedi'. In the villages the peasants' group with a 'hubble-bubble' in the centre reach the summit of folk-lore; in the towns and cities, inspirption sings and speaks where tea is in free circulation. Perhaps that is the reason why everyone feels inspired to attend a debate or a lecture where there is the flavoury prospect of delicious refreshment so necessary after the high intellectual strain.

To my mind, inspiration is like the sun, largess univeral, and every creature of flood, field and air imbibes it according to its capacity and nature among the same species in varying degrees. It identifies itself in name, also, with the object to which it attaches itself. As for instance, of earth, earthly, of heaven, heavenly, of air, aerial, of the sea, nautical, of matter, material, of spirit, spiritual, of night, nocturnal, of day, diurnal and so on. In arts and sciences, it assumes their very name. Thus it is literary, philosophical, psychological, aesthetical, mathematical, physical, chemical, botanical, zoological, etc. Trades, professions, vocations impress their seal upon it, and it becomes agricultural, industrial, political, educational, mechanical, electrical, commercial, martial, naval, musical etc. etc. Each is a thesis by itself and requires a whole volume on it. But a brief notice of a few of them, in view of the present exigent needs, will not be out of place. Agricultural inspiration which consists in mechanising it more and more has lately manifested itself in the legislation of agrarian reforms, whose repurcussions in some districts have tended to obviate the need of petty land-holders and tenants. Commercial inspiration lays more stress on hoarding, black-marketing and profiteering, and on collecting empty packages, covers, bottles of original reputed brands, particularly in medicines, drugs, soaps, inks etc., to use them for home-made substitutes by way of promoting indigenous industry. It further extends its ruthless dominion over cereals and foodstuffs. Preparation of dishes and foods with 'pure ghee' at restaurants and hotels is directed to the sublime purpose of preparing the masses for self-ordinance and self mortification, the first steps to spiritualism. Selling, at exhorbitant prices of synthetic salts, spices, peppers, etc., which owe their origin to genius equally expert in fakes and imitations as nature is in producing prototypes, of sugar heavy with moisture to supply this additional advantage to dry frames in this dry season, and of wheat mixed artistically with dust, so that the human body may be reminded of its clay-origin, — all this is indebted to the mysterious operations of this inspiration. Devitalising national health with synthetic products and adulterated commodities is an achievement in accord with the sublime doctrine of time-honoured asceticism which was first instituted by sages of old to shew that "fasting in body is feasting in soul". And as for educational inspiration, the fountain-head of all human progress, it stands conspicuous by "all prattle, and little practice". It recognises the

paramount importance of such labels as "anti-illiteracy drive", "adult literacy campaign", "education for all", opens certain centres in certain places, though most of them exist on the chart, but ignores the real source of ignorance *i.e.*, those little children who are our future hopes and hostages, those children (hundreds of thousands of them) who for want of means are both intellectually and morally starving, whose dark minds are eager to be illumined, whose bubbling energies are being wasted in romping, fighting, quarreling, gambling, poaching, picking pockets, or in wandering in bazars and streets to black the shoes of gentlemen, or in working as menial servants in hotels, and restaurants. It reminds me of the godess whose tread, as she went along, created a blooming paradise ahead, but left a hell of wilderness behind. The real question is not of "adult literacy", it is of "child-literacy". The present adult generation who is illiterate will do much less harm than the new and growing generation, as by such a system ignorace can never be exterminated. Educational inspiration further urges the opening of hundreds of schools, when hundreds of them that already exist present a piteous spectacle of rotten conditions. Ragged boys with ragged masters, and unhygienic buildings with an utterly inadequate staff, equipment and furniture constitute an eye-sore. Establishment of new ones when the old ones stand in need of urgent attention and improvement is like making confusion worse confounded, particularly when talent is reasonably shy of dedicating itself to the nation-building department which only holds out the prospect of living martyrdom through exceedingly low wages and humble status. It hardly bespeaks statesmanship and breadth of vision. Mass production, with a view to making mounting statistical figures figure in the report of achievements, causes the quality to deteriorate on which alone efficiency depends. Restricted space would not further permit me to treat of discipline, examinations, syllabii, modes of instruction, though they, too, are momentous questions.

Through long ages, inspiration has dwelt in the garret and nurtured eloquence, scholarship and philosophy amid the thundering, howling and pattering music of the storms, winds, and rains, and kept its ancient residence up till the middle of the last century, when as a result of many a revolution and progress in scientific discoveries and inventions it had to quit its old haunt and seek the mechanical conveniences and cushioned comforts and luxuries on the lower floors, and it appears that long use has largely facilitated and perfected the new adjustment.

In the sphere of international diplomacy and militarism, medieval knight-errantry offers an instructive contrast to the modern one. The knights of the Round Table, the Paladins of Charlemagne, and others, whose orders during the middle ages were numerous, adhered to certain noble principles of chivalry, honour, courtesy, valour, both at the court and the camp. They were seldom, if never, guilty of perjury, cowardice, breach of faith and honour. They went forth in quest of adventures and achieved worthy exploits before they were able to

win their golden spurs. They fought against monsters, dragons, giants that wrought havoc in the country round about, and set at liberty the long imprisoned beauty. They set forth on horseback to war with vice and evil, the demon of tyranny and injustice in any form, to tend the sick, relieve the distressed, soothe the sorrowing. They had no private ends to gain, though they were a part of the most formidable of systems — feudalism. The weapons they used were bows and arrows, lances and spears, swords and battle-axes, which were responsible for both bloodshed on a limited scale and for feats of arms. But inspiration in modern warfare is of a far deadlier kind. Knights of today, on the other hand, serve their apprenticeship in Colonialism, Imperialism, Nazism, Fascism, Socialism, Capitalism, Communism, etc. They hide the mid-day sun with their fighters and dive-bombers, cover the seas with their battle-ships and cruisers, and strew the earth with their armoured cars, tanks, and artilleries. They pile up pyramids of war amunitions, raise mountains of man-destroying machinery. They use rockets, bombs, shells, and missiles whose name is legion. Their language is very much akin to the iron hand gloved in velvet. Their voice, though calm, veils the thunders of a gun. They travel by planes in ether, by liners across the seas. by cars on land to put their heads together to spin theories to ease the practical pangs of mankind. They are forsworn in the act of swearing. They espouse armoured ideologies rather than pure truth and justice. Their pledges and promises are more honoured in the breach than in the observance and their platitudes are but platitudes. They wear silk after they have proved their potentialities for inhumanity and atrocity in concentration and prisoners of war camps, after they have laid waste whole countries and soaked the soil in the blood of the contrymen, after they have clean blotted out of existence Nagasaki and Hiroshima with the hell-power of the A-bomb. Constant supply of this inspiration will need another Adam to found another race, as the present one stands on the brink of extinction for its follies and corruption.

This way-side indulgence in what may seem to be a digression of ominous import, should not keep me from resuming the thread. Inspiration in regard to methods of work, specially in the quill-driving line, comprises again three types, which, in fact, are rather stages than types. The first I shall call The Productive Inspiration. Usually it visits you when you take up your pen to commit your thoughts to paper on a sudden or in an exigency. It hardly admits of long broodings at your leisure, as the race against time is a necessity. You start rightaway like the bather who knows that a direct plunge is the only safeguard against shivering in sight of cold water, and indite at a furious speed what comes into your mind. This flush of heat kindles a corresponding glow of inspiration. Your progress in composition of the article goes at a brisk rate till you come to the finish. Thus you make the job easy by handling it outright-

as gladiators in the brave days of yore used to take the wild bulls by the horns. This in my opinion is the right approach, though methodical psychologists may decline to approve it. Direct attack on the thing is what enables you to win not half but the whole battle.

The second type is known as The Revising Inspiration. Now that something has already emerged from what seemed to be a nebulous mass, in the heat of the moment, its form and colour can further be improved. The first thought spends itself on the manner and its flaws. Better expressions, phrases, words, nay even constructions, strike the mind, which did'nt occur to it before, almost imparting a new refined grace or emphatic vigour to the ideas set forth. It is up to you to see where sweet irony is needed, where satiric touch would serve the purpose better, where purple grandeur will sit apt and right. Sometimes at second thought, a whole passage must needs be recast. Then you pay attention to the subject-matter, also, examine its coherence, logical sequence, methodical treatment as far as possible, note its faults and foibles in the shape of contradictions and inconsistencies. You do your best to make it an organic whole, convincing and clear ; lapses are recovered, gaps and blanks filled, loopholes repaired, weak points fortified.

The final type assumes the title of The Finalising Inspiration. This, in fact, is the second revision of your thesis, distinguished from the previous one, which was fragmentary, by its integrity, and consists to some extent, of the overlaping process of the second type. Here you give final touches in point of general style, see to the minute punctuation marks, consider balance and rythm, alliteration and antitheses if any. In the course of perusal your own reactions register the likely effects. You are grave or gay according as the matter is grave or gay. Thus you try to form a general impression of the fruits of your hurried drive. In case you feel that the coin forged in the mint of your brain has the true ring and lustre, the article you have written has a particle of human folly or human wisdom to teach by caution or by instruction, then you let loose it on the public to take what course and to meet what fortune it may. But O ! gentle reader, this finalising inspiration need not necessarily be construed into the last word on the subject, particularly when the writer himself stands arraigned before the tribunal of his own conscience for a sin of omission concerning the invocation of the heavenly godess 'Urania' when setting forth on this long adventure.

★

Nur-ud-Din Amjad
B.A. Student

IN AN OMNIBUS

'OVER a cup of tea' has come to stay and mean, with a good deal of success, 'In a very light-hearted mood'. With equal truth, "In an omnibus" should also mean the same.

Because leaning back over the Latex foam cushions of an omnibus, moving at the speed of a few feet per minute, with a hoarse diesel-engine-music in the back ground one feels a strong craving to indulge in idle talk.

Really these buses of Lahore are the slowest moving things on the earth. No body knows whether it is for fear of damaging the ultra-modern air-conditioned, stream-lined buses or the roads on which they ply, that the speedometer is never allowed to record more than 5. Nay the passengers doubt if it is ever allowed to reach even 5. It is for this reason that men who matter (not that they shave with Gillette blades but) never travel by the Omibus.

Well that was just by the way. I was speaking of talking 'in an omnibus'. So sitting helpless the only thing one wishes for is somebody who is prepared to lend or rather send a pair of ears and then all sorts of knowledge, general or special, celestial or terrestrial are forced into these unfortunate ears. But the other man, being the occupant of the same bus, is also suffering from the same kind of what may be called 'Kruschen feeling', so he cannot sit mute for long either. Before long he, also, bursts into a cackle and consequently a heated discussion ensues. Problems of national and international importance are discussed. Views on government's internal and external policies are exchanged, and the weather is abused to one's heart's content, and such far-fetched ideas are made public that those sitting on the back benches cannot help laughing in their sleeves.

Just board this giant double-decker and what do you see, the two smart college boys before you are talking about the Gala opening of some picture at the city's 'theatre par excellence' While behind you some rustics are complaining about the rains which are too late. And from another seat a man with a newspaper in his hand is espousing the Iranian Oil nationalisation law with such force and vigour as if he were a second Mosaddaq or were just going to replace Hussain Makki on the Oil Nationalisation Board. By-the-by his voice rises to such a pitch that all the passengers get absorbed in it.

As the bus halts at a stop and the thread of the discussion is momentarily broken, you hear a whisper. One of the rustics behind you is asking his compan-

ion, " the gentleman is speaking of some Abadan again and again. Do you know where is it?" His companion replies with quite a serious air, " Well where is the difficulty? It must be somewhere near Mardan." The second Mosaddaq casts a glance around which betrays his bewilderment on the latest discovery and sinks himself in the paper.

The recent introduction of the double-deckers on Lahore roads has contributed much towards this practice. With enhanced beauty and comforts and with decreased speed and rush these buses have become far more agreeable chatting saloons than the outgoing and almost outmoded poor singledeckers. Moreover since all the postulates of Dr. Johnson's theory of the Garret apply to the upper deck of these buses, indeed they make ideal lounges for the students, journalists and all the garrulous community.

So it has become the hobby of some Lahore guys to have a joy-ride in a double-decker for their evening stroll. Costly as this hobby may appear but really it is not. For example suppose you board the upper deck of an omnibus right from the District Courts' stop and buy a ticket say for Jinnah Gardens, it cannot cost you more than three and a half annas, and behold what you get in return for it. A seat as good and comfortable as an ottoman to relax upon, have a panaromic view of the gay Lahore, and breathe as much of the fresh air (if there is any in Lahore) as your lungs can.

The Greek music catered by the powerful diesel engine is extra free of cost and for talking and listening to your fellow passengers there is no limit. While you will impart knowledge to others and make them wise, your own knowledge will also increase by leaps and bounds. You will know all the secrets of trade and life in this small compass of half an hour. You will know what the Churchill-Truman talk was about before it is made public; you wil know what the Kremlin is planning for the next year, and what new types of bombs she has in store, such reliable news! I am sure you can get Marshall aid if you inform the American Ambassador.

And then you will just faint to know how the Indian Navy is planning to fight in Kashmir in the event of war and that it was due to the Atomic explosions in Los Vegas (U. S. A.) that we had a comparatively warm winter this year. So that you will alight at your destination with a heavy heart to lose the company of such 'well-informed' people.

So my advice to young men is that it is high time that we should get omnibus-minded and talk "in an omnibus" instead of 'over a cup of tea.' Because while it pays to travel by omnibus, it is quite useless to drink tea—and tea has got no vitamins either !

★

Dr. M. Abdul Qavi Luqman,
M. B., B. S.

Islamic Law and Alcoholics

ISLAM lays down laws to guide us in our day to day life, but is not a respector of prejudices and bias. The divine guidance throuhg Alkitab (Quran) and Alsunnah (The Holy Traditions) inculcates a healthy instinct which helps us to discriminate between right and wrong, and gives us clear injunctions when our own resources of intelligence and understanding reach the end of their tether.

Alcoholic Drinks have been banned in clear terms. But for this divine guidance, human wisdom could not have been depended upon to give a clear cut decision. You know how humanity is divided on the subject, and what mountains of literature have been produced in all languages and ages in praise of this Mother of Sinister Temptors (Ummul-Khabais). The verdict of Islam emanates from the Super Intellect. It does not deny the occasional virtues or timely benefits accruing from drinks, but warns against the ultimate harm that invariably overwhelms.

Medically we know that alcoholics are poisons which paralyse Brain-centres, in accordance with a definite law—The Law of Dissolution. The centres to develope last of all in the scale of evolution are the first victims of poison and others follow suit in the reverse order of Evolution, the result being that the finest feather in the cap of human evolution—The Centre of Responsibility—which in ordinary life is an inhibitory monitor on our (mis)-behaviour, is the first light to be extinguished. The animal in us frisks in all buoyancy. Eating, drinking and lustiness become unbounded. As the effect deepens the higher animal functions, too, get blunted and a baser animal comes to the fore. If boozing continues the animal is reduced to a vegetable which just exists, and further continued poisoning puts out the last flicker of existence.

It is definitely established that when a person turns loquacious and socially bright with the initial sips of a drink and believes himself to be doing fine, actually he is not capable of using his most highly developed virtues, with which education and evolution have furnished his mind, and is indeed behaving as a person of lower stratum of society. The finer movements that human beings are enabled to perform by expert co-ordination of muscles as a result of diligent training, when we learn the fine arts, are dulled at the early stages of alcoholic influence. Scientifically this expression "Lengthening of reflex time" (or depression of reflex arc) denotes the same state of affairs. It is this state of affairs that leads to road-accidents with high powered automobiles

at the hands of self-deceived inebriate individuals.

Statistics show that ninety percent of crime of every description is initiated, provoked, abetted or acquiesced in, under the influence of Alcoholics 75% of Lunacies, even those leading to Murders or Suicides have their origin in drink poison. 80% of all self-debasing crimes against women and the shameful sex perversions are perpetrated under the charm of "the Fairy of the Bottle."

More-over there is an uncontrollable desire in the inebriate to desire more and still more drink, and he so easily yields to the craving if he can lay his hands on it, and thus the "occasional one-pegger" easily becomes a boozer The more a man indulges in drinks, the less is his control over himself.

An important feature of the whole tragedy is, that the tipsy person is not in the least conscious of what is really happening to him. He is mighty pleased with his own behaviour and workmanship, while those around him are led to hold the opposite view.

Islam has legislated clearly and firmly for the good of humanity. No Drinks in any guise.

The Messenger of Almighty, the learned theologians, and the most conscientious commentators have given detailed instructions "What intoxicates in bulk is forbidden in the minutest quantity" and that, however you dilute or mix an alcoholic drink with soda, juices, ice or water, remains under an un-alterable taboo.

IVY OF PREJUDICE

On this legislative superstructure has crept the ivy of Prejudice and Bias. Some pseudo-theologians in their zeal for piety and extreme caution have dubbed all aromatic essences, scents, medicinal extracts and tinctures prepared with the aid of alcoholic chemicals unclean and placed under unequivocal prohibition. This is the other extreme, and extremes are never right.

FUNDAMENTALS GOVERNING DIVINE PROHIBITION

Here are the fundamentals governing divine prohibition, which must guide us in our thought and deed.

1. It is only the divine Prerogative to taboo or prohibit the use of any article as Haram. Any one who arrogates this function to himself is a wrong-doer and Mushrik.

2. While it is mighty sinful audacity to permit the use of anything tabooed by divine laws, it is no less sinful to lay a taboo on anything not so treated by divine law. The idolators of Mecca and the Jews erred in this direction and are clearly indicated by Alquran.

3. An article declared unclean, forbidden or "haram," is banned in the declared form. The chemical constituents of the forbidden article do not carry the stigma.

For example, urine, foeces, blood and wines are filthy and unclean and completely prohibited for ingestion, under normal circumstances, (barring the emergency when they can become lifesavers). But when these very substances have been broken up into their chemical constituents none of the resulting products of disintegration come under the taboo. We all know what highly coveted manures are, how our food-grains thrive on them.

Chemically Alcohols form a long category of organic chemical compounds. One of them, together with many other significant ingredients, occurs in forbidden drinks. That very alcohol (Ethyl Alcohol) is also found in many highly prized articles of our daily diet. Honey, fresh and preserved fruit, leavened bread and Nabiz (prepared by seeping dates in water for one to three days)—all contain ethyl alcohol, detectable on chemical analysis. All these articles were particularly the favourite food of Hazrat Mohammad (peace be on him and his progeny and associates), and are definitely most clean dainties (Teyyebat).

So the correct interpretation of the divine law of Islam is :—All Fermented drinks : Produced and used for the Purpose of Intoxication, are Forbidden. Wines, Sherry Champaign, brandy, beer, port, or whatever name you give them come under this category. The alcohol as chemically pure componnd has no stigma attached to it, and its use in trade or industry suffers from no prohibition.

Teacher: "Now tell Bobby, where is the elephant found ?"
Bobby : "The elephant, teacher, is such a large animal, it's scarcely ever lost",

Ralph : "I'm homesick".
Louis : "Is'nt that your home ?'
Ralph : "Yes, but I'm sick of it,"

Naeem Ahmad

Intellectual and Social Circle

FAZL-E-UMAR HOSTEL UNION

President	...	Muhammed Aslam Bajwa
Vice-President	...	M. Anwar Ahmad Mubashir.
Secretary	...	Bashir Ahmad Rafiq.
Joint Secretary	...	Abid Ali Abid.
Secretary Common-room		Bashir Ahmad Haji,

During the current session the Union arranged two dinners in honour of the companions of the Promised Messiah. Another dinner was given to Malik Ata-ur-Rahman, Missionary France, and Malik Ihsanul Haq Missionary East Africa. Under the auspices of the Union three declamation contests were held, two in Urdu and one in English. It is heard that the Union has decided to arrange a Mushaira and a picnic to the river Ravi, in the near future.

BAZM-E-URDU

President	...	Mahbub Alam Khalid, M.A.
Vice-President	...	Sayed Mubasharat Ahmad.
Secretary	...	Mohammad Ali.
Asst. Secretary	...	Mohammad Sulaiman.

The Bazm has had a very busy session. The following authorities read their original papers on the subjects noted against their names.

1. Maulana Salah-ud-Din Ahmad, Editor, " Adabi Duniya" ... "The beginning and evolution of 'NAAT' in Urdu poetry."
2. Dr. Ibadat Barelvi, M.A., Ph.D. ... "On Urdu Critics."
3. Dr. Abul Lais Siddiqui, M.A., Ph.D. ... "Theories on the origin of Urdu laugnage".
4. Mahbub Alam Khalid, M A. ... "Evolution of Urdu Poetry."

MAJLIS-E-IRSHAD

Persident	...	Maulvi Arjumand Khan, H.A.
Vice-Presidents	...	M. A. Khalid, M.A., Maulvi Ghulam Ahmad, H.A.
Secretary	...	M. Anwar Ahmad Mubashir.

The Majlis has been formed to introduce and interpret modern world problems in the light of Islam and to inculcate among the rising generation

the ideals of Islam. In its efforts to make Islam a practical study, controversial issues are scrupulously left out and empbasis is laid on the beauties of Islam.

The following spoke on the subjects noted against their names:—

1. Malik Ata-ur-Rahman Missionary France ... "The future of Islam in Europe."
2. Maulana Jalal-ud-din Shams Late Imam London Mosque. ... "Necessity of acquiring the knowledge of Quran".

ECONOMICS SOCIETY

PATRON	...	F. R. Faizi, M.A.
President	...	Ch. Aziz Ahmad.
Vice-President	...	Bashir Ahmad Rafiq.
Secretary	...	Ijaz Ahmad.
Joint-Secrtary	...	Mansoor Mobarak.

The Society has been holding regular meetings in which students take keen and active interest. The following authorities have delivered their lectures on the subjects noted against their names.

1. Mr. Munir Hussain, M.A., Lecturer, Punjab University. ... Industrial development of Pakistan.
2. Mr. Zia Samad, M.A., Lecturer, Dyal Singh College. ... Agrarian Reforms.
3. Azam Aurakzai, M A., Lecturer, Punjab University. ... Future of Agriculture.
4. Dr. S. M. Akhtar, M.A., Ph.D., Head of the Economics Department, Punjab University. ... Conditions of Economic Progress of Pakistan.

ARABIC SOCIETY

President	...	S. Basharatur Rahman, M.A.
Vice-President	...	Ch. Mushtaq Ahmad.
Secretary	...	Bashir Ahmad.
Joint Secretary	...	Abdul Majid Shahid.

The Society's aim is to promote interest in Arabic among the young generation. Arabic is our religious language and, moreover, Quranic knowledge cannot be gained without it.

Recently under the auspices of the society a recitation competition of Quranic verses was held, in which a considerable number of students participated. On another occasion Qazi Zaheer-ud-Din, Head of the Department of Arabic, Islamia College, delivered a lecture on "The Future of Arabic in Pakistan".